مطالعۂ قرآنِ حکیم کا
منتخب نصاب

حصّہ ششم

نکات برائے درس وتدریس

انجمن خدّام القرآن سندھ، کراچی (رجسٹرڈ)

قرآن اکیڈمی، خیابانِ راحت، درخشاں، ڈیفنس فیز VI، کراچی

فون نمبر: 5340022-23، فیکس: 5840009

ای میل: karachi@quranacademy.com

ویب سائیٹ: www.quranacademy.com

نام کتاب ——— منتخب نصاب - حصّہ ششم

نکات برائے درس وتدریس

طبع اوّل (اپریل 2006) ——— 1000

زیرِاہتمام ——— شعبۂ تعلیم وتدریس

انجمن خدّام القرآن سندھ، کراچی

مقام اشاعت ——— قرآن اکیڈمی، DM - 55،

درخشاں، فیز VI ڈیفنس، کراچی

www.hamditabligh.net

انتساب

اُن باہمت حضرات وخواتین کے نام

جوالفاظِ قرآنی

هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ (یونس: 58)

پر یقین کی عملی مثال قائم کرتے ہوئے

اور حدیثِ نبوی ﷺ

خَيْرُ كُمْ مَّنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَ عَلَّمَهٗ (بُخَارِیؒ)

کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے

دنیا کی عارضی لذتوں کے مقابلے میں

آخرت کی ابدی کامیابی کے حصول کے لئے

اپنی بہترین صلاحیتیں

قرآنِ کریم کے سیکھنے اور سکھانے کے لئے

وقف کردیں۔

فہرست

1	سورۂ حدید حصّہ اوّل: آیات **1** تا **6**	8
2	سورۂ حدید حصّہ دوم: آیات **7** تا **11**	31
3	سورۂ حدید حصّہ سوم: آیات **12** تا **15**	51
4	سورۂ حدید حصّہ چہارم: آیات **16** تا **19**	69
5	سورۂ حدید حصّہ پنجم: آیات **20** تا **24**	82
6	سورۂ حدید حصّہ ششم: آیت **25**	119
7	سورۂ حدید حصّہ ہفتم: آیات **26** تا **29**	137

حوالہ جات

☆ ''مطالعۂ قرآنِ حکیم کا منتخب نصاب'' کتابی صورت میں جس میں منتخب نصاب میں شامل تمام مقامات کا متن، ترجمہ اور مختصر تفسیر موجود ہے۔

☆ منتخب نصاب کے تمام مقامات کے مختصر لیکن جامع دروس پر مشتمل **الھدیٰ** سیریز کے **44** آڈیو کیسٹس

☆ منتخب نصاب کے تمام مقامات کے دروس پر مشتمل **الھدیٰ** کمپیوٹر **CD**

☆ منتخب نصاب کے تمام مقامات کے تفصیلی دروس پر مشتمل **98**

منتخب نصاب حصّہ ششم

سورۂ حدید

منتخب نصاب کا حصّہ ششم قرآنِ حکیم کی ایک مکمل سورۃ یعنی سورۂ حدید کے تفصیلی مطالعہ پر مشتمل ہے۔ اِس سورۃ کے بارے میں قابلِ ذکر نکات حسبِ ذیل ہیں :

۱- سورۂ حدید مکی- مدنی سورتوں کے چھٹے گروپ کی دس مدنی سورتوں میں شامل ہے۔ اِن سورتوں میں حسبِ ذیل خصوصیات ہیں :

- اِن میں سے اکثر سورتوں کا زمانۂ نزول مدنی دور کا نصف ثانی ہے۔ اِس دور میں امتِ مسلمہ کی تشکیل ہو چکی تھی اور ایک مسلم معاشرہ وجود میں آ چکا تھا، لہٰذا اِن سورتوں میں خطاب صرف مسلمانوں سے ہے۔ کفار کا ذکر ضمنی طور پر ہے اور اُن میں سے خصوصًا اہلِ کتاب کا ذکر ہے بطورِ عبرت۔ اہلِ کتاب مسلمانوں سے قبل امت کے منصب پر فائز تھے لیکن اُن میں بعض ایسی اعتقادی اور عملی گمراہیاں آ گئیں جن کی وجہ سے اللہ اُن سے ناراض ہو گیا۔ اِن سورتوں میں ہمیں دعوتِ غور و فکر دی جا رہی ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ یہ گمراہیاں کن کن راستوں سے آئیں اور پھر ہم اِن گمراہیوں سے محفوظ رہنے کی کوشش کریں۔
- اِن سورتوں میں ملامت اور جھنجھوڑنے کا انداز بہت نمایاں ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ مجموعی اعتبار سے مسلمانوں کے جذبۂ عمل میں کچھ کمی واقع ہو رہی ہے جس پر متوجہ کیا جا رہا ہے جیسے :

وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۚ وَالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ

''اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم ایمان نہیں رکھتے اللہ پر جبکہ رسولؐ تمہیں دعوت دے

رہے ہیں کہ ایمان لاؤ اپنے رب پر۔'' (الحدید :8)

وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

''اور تمہیں کیا ہوا ہے کہ اللہ کے رستے میں خرچ نہیں کرتے حالانکہ آسمانوں اور زمین کی وراثت اللہ ہی کی ہے۔'' (الحدید :10)

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ (الحدید :16)

''کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ مومنوں کے دل جھک جائیں اللہ کی یاد اور اُس حق کے لئے جو نازل ہو چکا ہے اور لوگ اُن کی طرح نہ ہو جائیں جن کو پہلے کتابیں دی گئی تھیں، پھر اُن پر زمانہ طویل گزر گیا (غفلت میں) تو اُن کے دل سخت ہو گئے اور اُن میں سے اکثر نافرمان ہیں۔''

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَاۗءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَاۗءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ (الممتحنہ :1)

''مومنو! دوست نہ بناؤ میرے اور اپنے دشمنوں کو، تم اُن کی طرف محبت کے پیغام بھیجتے ہو جبکہ وہ کفر کر چکے ہیں اُس حق کا جو تمہارے پاس آ چکا ہے۔''

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ

كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (الصّف :2 - 3)

''مومنو! تم ایسی باتیں کیوں کہا کرتے ہو جو کیا نہیں کرتے؟ اللہ اِس بات سے سخت بیزار ہے کہ تم ایسی بات کہو جو کرو نہیں۔''

جھنجھوڑنے کے اِس اسلوب کے ہم زیادہ مستحق ہیں اِس لئے کہ آج ہماری اکثریت کی عملی صورتِ حال اُس دور کے منافقین سے بھی زیادہ گئی گزری ہے۔

- اِن سورتوں میں اہم مضامینِ قرآن کے خلاصے بیان کیے گئے ہیں مثلاً ایمان

کے موضوع پر تمام تعلیماتِ قرآنی کا خلاصہ سورۂ تغابن میں ہے، نفاق کے موضوع پر تمام تعلیماتِ قرآنی کا خلاصہ سورۂ منافقون میں ہے، جہاد فی سبیل اللہ کے موضوع پر تمام تعلیماتِ قرآنی کا خلاصہ سورۂ صف میں ہے وغیرہ وغیرہ۔

- اِن سورتوں میں سے پانچ کا آغاز تسبیح باری تعالیٰ سے ہوا ہے اور اِنہیں مسبحات کہا جاتا ہے۔ سورۂ حدید-سورۂ حشر-سورۂ صف کے آغاز میں ماضی کا صیغہ سَبَّحَ آیا ہے اور سورۂ جمعہ-سورۂ تغابن کے آغاز میں مضارع کا صیغہ یُسَبِّحُ استعمال ہوا ہے۔ سورۂ حشر اِس اعتبار سے منفرد ہے کہ اِس کی پہلی اور آخری آیت میں تسبیح کا بیان ہے۔

مذکورہ بالا خصوصیات کی وجہ سے مذکورہ بالا دس سورتوں میں سے چھ سورتیں منتخب نصاب میں شامل کی گئی ہیں۔ حصہ دوم میں سورۂ تغابن، حصہ سوم میں سورۂ تحریم، حصہ چہارم میں سورۂ صف، سورۂ جمعہ، سورۂ منافقون اور حصہ ششم میں سورۂ حدید شامل ہے۔

۳-سورۂ حدید اِن تمام سورتوں میں سب سے جامع سورۃ ہے کیونکہ یہ اُن تمام مضامین کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے جو بقیہ سورتوں میں الگ الگ زیر بحث آئے ہیں۔ اِس سورۃ کا موضوع ہے ''دینِ اسلام کے تقاضے''۔ ہماری دینی ذمہ داریوں کے حوالے سے قرآنِ حکیم کی تعلیمات کا خلاصہ اِس سورۂ مبارکہ میں جامعیت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔

۴ - مضامین کے اعتبار سے سورۂ حدید کی آیات کا تجزیہ اِس طرح ہے :

آیات : **1 - 6** ذات و صفاتِ باری تعالیٰ

آیات : **7 - 11** دینِ اسلام کے تقاضے

آیات : **12 - 15** دین کے تقاضے اور انجامِ آخرت

آیات : **16 - 19** قربِ الٰہی کے حصول کا راستہ

آیات : **20 - 24** حیاتِ دنیا اور اِس کے حوادث

آیت : **25** تمام رسولوں کا مشن - نظامِ عدل کا قیام

منتخب نصاب حصّہ ششم

سورۂ حدید حصّہ اوّل : آیات 1 تا 6

ذات و صفاتِ باری تعالیٰ

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ O بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ O

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (1) لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يُحْيِىْ وَيُمِيْتُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ (2) هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ (3) هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِىْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِى الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (4) لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (5) يُوْلِجُ الَّيْلَ فِى النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِى الَّيْلِ وَهُوَ عَلِيْمٌ ۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (6)

سورۂ حدید کی ابتدائی چھ آیات معرفتِ خداوندی کے حصول کے لئے ایک بہت بڑا خزانہ ہیں۔ اِن چھ آیات میں ذات و صفات باری تعالیٰ کا بیان اعلیٰ ترین علمی سطح پر وارد ہوا ہے۔ قرآنِ حکیم پوری نوعِ انسانی کے لئے ہدایت بن کر نازل ہوا ہے۔ یہ عوام کے لئے بھی ہدایت ہے اور بڑے سے بڑے مفکر، فلسفی اور دانشور کے لئے بھی۔ قرآنِ حکیم میں عوام الناس کی ہدایت کے لئے عام فہم انداز اختیار کیا جاتا ہے جبکہ ذہین اور صاحبِ فہم لوگوں (*intellectuals*) کے لئے خفی اسلوب میں اشارات موجود ہیں جو اُن کی ذہنی رہنمائی

کے لئے کفایت کرتے ہیں اور جن پر غور وفکر کے ذریعے وہ اپنی علمی وفکری الجھنوں کو رفع کر سکتے ہیں۔ عام فہم انداز میں توحید کا بیان قرآنِ حکیم میں بے شمار مقامات پر اور مختلف اسالیب سے ملتا ہے، لیکن اپنی بلند ترین سطح پر یہ مضمون اِن چھ آیاتِ مبارکہ میں زیر بحث آیا ہے۔

☆ آیت : 1 :

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ -- پاکی بیان کی اللہ کی ہر اُس شے نے جو آسمانوں اور زمین میں ہے -- وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝ اور وہ غالب حکمت والا ہے۔

- یہ آیت سورۃ کی پرشکوہ تمہید ہے جو بیان کر رہی ہے کہ اے مسلمانو! ایک ایسا خالق تم سے مخاطب ہے جس کی تسبیح ارض وسماء کی ہر شے کر رہی ہے۔ وہ پوری طرح سے غالب اور کمالِ حکمت والا ہے۔
- سَبَّحَ - یُسَبِّحُ کے لغوی معنی ہیں تیرانا یعنی کسی شے کو اُس کے اصل مقام پر برقرار رکھنا اور اصطلاحی معنی ہیں پاکی بیان کرنا۔ تسبیحِ باری تعالیٰ سے مراد اِس حقیقت کو بیان کرنا ہے کہ اللہ ہر کمی، ہر عیب، ہر نقص، ہر احتیاج اور ہر کمزوری سے پاک ہے ۔ یہ شان صرف اللہ کی ہے لہٰذا تسبیح کے ذریعہ ہم اللہ کے اُس مقام پر ہونے کا اقرار کرتے ہیں جہاں اُس کا کوئی ساجھی نہیں۔
- لفظ ''مَـــا'' کے استعمال سے ''کل مکان'' (Space) کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اِسی طرح ان مدنی سورتوں میں تین بار ماضی کا صیغہ سَبَّحَ (سورۂ حدید-سورۂ حشر-سورۂ صف کے آغاز میں) اور تین ہی بار مضارع کا صیغہ یُسَبِّـــحُ (سورۂ جمعہ و سورۂ تغابن کے آغاز اور سورۂ حشر کے آخر میں) استعمال کر کے ''کل زمان'' (Time) کا احاطہ کیا گیا ہے۔ گویا ہر وقت اور ہر جگہ کائنات میں ہر شے اللہ کی تسبیح کرتی رہی ہے، کر رہی ہے اور کرتی رہے گی۔
- کائنات کی ہر شے اللہ کی تسبیح کر رہی ہے سے مراد یہ ہے کہ جس شے پر بھی غور کیا

جائے وہ اپنے وجود سے اپنے خالق کی صناعی و کاریگری کی خوبی و مہارت کا شاہکار نظر آتی ہے۔ مشرق سے ابھرتا ہوا سورج، چمکتے ہوئے چاند اور ستارے، وسیع و عریض آسمان و زمین، اونچے اونچے پہاڑ، برستی ہوئی بارشیں، ٹھاٹھیں مارتے سمندر، بہتے ہوئے دریا، چلتی ہوئی ٹھنڈی اور گرم ہوائیں، موسموں کے تغیر و تبدل، رات اور دن کا الٹ پھیر، لہلہاتی ہوئی کھیتیاں، گھنے باغات، طرح طرح کے پرندے، حیوانات اور حشرات ایک عظیم خالق، باری اور مصور کی تصویر گری کا کمال پیش کر رہے ہیں۔ بقول اقبال :

کھول آنکھ زمیں دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ
مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

ہر شے اپنی ذات سے اللہ کے کمالات کا اظہار کر رہی ہے اور اپنے وجود سے اُس کے ہر نقص سے بری اور ہر عیب سے پاک ہونے کا اعلان کر رہی ہے۔ اِن مظاہر فطرت پر غور ہمارے لئے معرفتِ خداوندی کے حصول کا کیا خوب ذریعہ ہے!

- کائنات کی ہر شے زبانِ حال سے اپنے خالق کی صناعی اور کمالِ تخلیق کا اعلان تو کر ہی رہی ہے لیکن اُسے اللہ نے قوتِ گویائی بھی دی ہے جس سے وہ تسبیحِ حالی کے ساتھ ساتھ تسبیحِ قولی بھی کر رہی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

تُسَبِّحُ لَـهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِیْهِنَّ ؕ وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ ۝ (بنی اسرائیل : 44)

''ساتوں آسمان اور زمین اور جو مخلوقات اِن میں ہیں، سب اُسی کی تسبیح کرتے ہیں اور (مخلوقات میں سے) کوئی چیز نہیں مگر اُس کے شکر کے ساتھ تسبیح کرتی ہے لیکن تم اُن کی تسبیح کو نہیں سمجھتے۔''

- اِس آیت میں اللہ کی دو صفات عزیز اور حکیم بیان ہوئی ہیں۔ عزیز کی صفت اللہ تعالیٰ

کے اختیارِ مطلق کو ظاہر کرتی ہے یعنی اللہ جو چاہے کر گزرتا ہے۔ وہ کل اختیار کا مالک ہے اور اُس کی مرضی کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ اللہ کی یہ صفت قرآنِ حکیم میں اکثر صفتِ حکیم کے ساتھ آتی ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں ہمارا تصور یہ ہے کہ جہاں اختیار زیادہ ہوتا ہے وہاں اُس کے غیر عادلانہ استعمال کا امکان بھی زیادہ ہوتا ہے۔ چنانچہ پولیٹکل سائنس میں یہ بات ایک اصول کی حیثیت سے مانی جاتی ہے کہ :

Authority tends to corrupt and
absolute authority corrupts absolutely.

اللہ کی صفتِ عزیز کے ساتھ صفتِ حکیم کا آنا ظاہر کرتا ہے کہ اللہ اپنے اختیارات کو حکمت کے ساتھ استعمال فرماتا ہے اور کسی پر کوئی ظلم نہیں فرماتا۔ اِس ضمن میں یہ احتیاط البتہ پیشِ نظر رہنی چاہیئے کہ یوں نہ کہا جائے کہ اُس کا اختیار حکمت کے تحت استعمال ہوتا ہے۔ اللہ جیسے اپنی ذات میں مطلق ہے ویسے ہی اُس کی تمام صفات بھی مطلق ہیں۔ اُس کی کوئی صفت دوسری صفت کے تابع نہیں۔ اُس کا اختیارِ مطلق ہے اور اُس کی حکمت بھی مطلق ہے۔ لہٰذا ''اختیارات کا استعمال حکمت کے ساتھ'' کے الفاظ زیادہ صحیح اور محفوظ ہیں۔

☆ آیت : **2** :

لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ -- اُسی کے لئے ہے بادشاہت آسمانوں اور زمین کی -- یُحْیٖ وَیُمِیْتُ -- وہ زندہ کرتا ہے اور موت دیتا ہے -- وَھُوَعَلٰی کُلِّ شَیءٍ قَدِیْرٌ﴿﴾ اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

- لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کے الفاظ دو معنی ظاہر کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ

آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا حق اللہ ہی کو پہنچتا ہے اور دوسرے یہ کہ فی الواقع بھی یہاں اللہ ہی کی بادشاہی اور حکمرانی ہے۔ جدید اصطلاحات میں یوں کہیں گے کہ "De facto" بھی وہی بادشاہ ہے اور "De Jure" بھی اُسی کی بادشاہی ہے۔ اللہ ہی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ یہاں حکمرانی کرے۔ سورۃ الاعراف آیت **54** میں فرمایا گیا کہ اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ -- تخلیق اُس کی ہے لہٰذا حکم بھی اُسی کا چلے گا۔ کائنات اُس نے پیدا کی ہے چنانچہ اُسی کی مرضی اور اُسی کا اختیار یہاں جاری و ساری ہے۔ اللہ کے سوا کسی اور کو بادشاہ یا حاکم ماننا ایک بہت بڑا شرک ہے۔ بادشاہی صرف اللہ کے لئے ہے، بقول اقبال :

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اِک وہی ، باقی بتانِ آزری!

پہلے اِس شرک کا ارتکاب ایک شخص فرعون کی صورت میں کرتا تھا جب وہ حاکمیت کا دعویٰ کرتا تھا کہ ''اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی'' میں ہوں تمہارا سب سے بڑا رب (النازعات :**24**)۔ اب انسانی حاکمیت (**Human Sovereignty**)، نظری طور پر عوامی حاکمیت (**Popular Sovereignty**) میں تبدیل ہو چکی ہے۔ گویا وہ ٹنوں گندگی جو پہلے ایک شخص کے سر پر تھی، اب تولہ تولہ ماشہ ماشہ عام آدمی کو بھی پہنچا دی گئی ہے۔ اسلام کے نزدیک حاکمیت صرف اللہ کی ہے۔ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کا مفہوم یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین کی حکومت کا حق صرف اللہ کو حاصل ہے اور بالفعل بھی وہی حاکم ہے۔

- اِس کائنات میں اصل اختیار تو اللہ ہی کے پاس ہے لیکن اُس نے امتحان کے لئے ہمیں معمولی سا اختیار دے دیا ہے۔ ہمارا یہ اختیار نہایت محدود ہے کیونکہ ہمارے

اپنے وجود پر بھی اکثر و بیشتر اللہ ہی کا حکم جاری و ساری ہے۔ ہمارے دل کی حرکت، ہمارے جسم میں خون کی گردش، ہمارے جسم پر بالوں کی افزائش وغیرہ ہمارے اختیار میں نہیں بلکہ اللہ ہی کے قانون کے تابع ہے۔ اللہ نے انسان کو ایک ذرا سا اختیار دینے کے بعد آزادی دی کہ اِمَّا شَاکِرًا وَّاِمَّا کَفُوْرًا -- چاہے وہ اللہ کا شکر گزار بن کر رہے اور چاہے ناشکری کی روش اختیار کرے۔ یہ ہلدی کی وہ گانٹھ ہے کہ اِس کو لے کر اگر کوئی پنساری بن بیٹھے تو بن جائے لیکن روزِ قیامت یہ اختیار، اقتدار، فرعونیت اور قارونیت سب طشت از بام ہو جائے گی۔ معلوم ہوگا کہ وَمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا اِلَّا لَھْوٌ وَّلَعِبٌ دنیا کی زندگی نہیں تھی مگر ایک ڈرامہ۔ اِس ڈرامہ میں مختلف لوگوں کو عارضی طور پر مختلف کردار دے دیئے گئے تھے جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

- آیت کے اگلے حصہ میں فرمایا یُحْیٖ وَیُمِیْتُ -- وہی زندہ رکھتا ہے اور وہی موت دیتا ہے۔ آیت کا یہ حصہ اُس گمراہی کا ازالہ کرتا ہے جس کا ذکر سورۂ جاثیہ آیت **24** میں یوں کیا گیا کہ مَا ھِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَنَحْیَا -- نہیں ہے کوئی زندگی سوائے اِس دنیا کی زندگی کے، ہم خود مرتے ہیں، خود جیتے ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ حیات و موت کا سلسلہ از خود نہیں چل رہا بلکہ یہ اللہ کے حکم کے تحت ہے۔ سورۂ آلِ عمران آیت **145** میں فرمایا گیا وَمَا کَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ کِتٰبًا مُّؤَجَّلًا -- کسی ذی نفس کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ مر جائے مگر اللہ کے حکم سے، اُس (موت) کا تو ایک معین وقت ہے لکھا ہوا۔ یہ مادہ پرستانہ نظریہ ہے کہ ہم خود سے زندہ ہیں اور ہم خود ہی مرتے ہیں جبکہ اللہ پر ایمان اور اُس کی معرفت کا مظہر یہ یقین ہے کہ اللہ ہی ہمیں زندہ رکھے ہوئے ہے اور وہی ہمیں موت دے گا۔ ہم اگر موت سے فرار اختیار کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے اور اگر خود سے

مرنا چاہیں تو نہیں مر سکتے جب تک اللہ کا حکم نہ ہو۔

- آگے فرمایا وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ -- اور وہ ہر چیز پر قادر ہے"۔ یہ الفاظ قرآنِ مجید میں کئی بار آئے ہیں۔ اِن الفاظ کے ذریعہ اللہ نے کفار کے اِس اعتراض کا جواب دیا ہے کہ کیسے ممکن ہے کہ جب ہم مر جائیں اور ہماری ہڈیاں بھی بوسیدہ ہو کر چورا چورا ہو جائیں تو ہمیں دوبارہ زندہ کیا جائے۔ اللہ ہر شے پر قادر ہے یعنی جب وہ نطفہ سے مکمل انسان بنا سکتا ہے تو بوسیدہ ہڈیوں سے دوبارہ زندہ کرنے کی بھی قدرت رکھتا ہے۔
- عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ میں لفظ" کُل "اللہ تعالیٰ کی معرفت کے اعتبار سے ہمارے لئے پناہ گاہ ہے۔ جہاں تک للہ کی معرفت کا معاملہ ہے تو ہم اللہ کی ذات کا ادراک تو کر ہی نہیں سکتے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے الفاظ ہیں :

اَلْعِجْزُ عَنْ دَرْکِ الذَّاتِ اِدْرَاکُ

"اللہ کی ذات کے ادراک سے عاجز ہونے کا احساس ہی ادراک ہے۔"

حضرت علیؓ نے اِس پر کیا خوب اضافہ فرمایا :

وَالْبَحْثُ عَنْ کُنْہِ الذَّاتِ اِشْرَاکُ

"اللہ کی ذات کے بارے میں کھوج کرید کرنا شرک ہے۔"

ہمیں اللہ کی معرفت صرف صفات کے حوالے سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ البتہ اُس کی صفات کی بھی اصل کیفیت (Quality) اور کمیت (Quantity) ہمارے فہم سے بالاتر ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ سمیع یعنی سننے والا ہے، لیکن وہ کیسے سنتا ہے؟ کتنا سمیع ہے؟ ہم نہیں جان سکتے۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ قدیر ہے، لیکن کتنا قادر ہے؟ اِس کا احاطہ کرنا ہمارے لئے ممکن نہیں۔ لفظ" کُل "ہمارے لئے عافیت کا ذریعہ ہے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے، وہ ہر شے کا علم رکھنے والا ہے، وہ ہر شے پر گواہ ہے، وہ ہر

شے سے باخبر ہے اور وہ ہر شے کو دیکھنے والا ہے۔

☆ آیت : 3 :

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ -- وہی ہے پہلا اور آخری اور ظاہر اور پوشیدہ -- وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿﴾ اور وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔

- اِس آیت میں اللہ کی چار صفات بیان ہوئی ہیں۔ اَلْاَوَّلُ- وہ ہستی جو سب سے پہلے ہو۔ اَلْاٰخِرُ - وہ ہستی جو سب سے آخر میں ہو۔ اَلظَّاهِرُ - وہ ہستی جو بالکل نمایاں ہو یا وہ ہستی جو غالب اور چھائی ہوئی ہو :

معمور ہو رہا ہے عالم میں نور تیرا
از مہ تا بہ ماہی سب ہے ظہور تیرا

اَلْبَاطِنُ - وہ ہستی جو مخفی ہے اور جس کی حقیقت کو کوئی نہیں جان سکتا :

ردائے لالہ و گل پردۂ مہ و انجم
جہاں جہاں وہ چھپے ہیں' عجیب عالم ہے!

- سورۂ حدید کی یہ تیسری آیت قرآنِ حکیم کے مشکل ترین مقامات میں سے ایک ہے۔ اِس آیت میں پہلی صفت اَلْاَوَّلُ بیان ہوئی ہے جو بظاہر دوسری صفت اَلْاٰخِرُ کی ضد ہے۔ اِسی طرح تیسری صفت اَلظَّاهِرُ ہے جو بظاہر چوتھی صفت اَلْبَاطِنُ کی ضد ہے۔ ویسے تو اللہ کی اور صفات بھی باہم متضاد ہیں جیسے وہ اَلْمُذِلُّ (ذلیل کر دینے والا) بھی ہے اور اَلْمُعِزُّ (عزت دینے والا) بھی۔ اِس طرح کی صفات کا بیک وقت ایک ذات میں ہونا سمجھ میں آتا ہے۔ لیکن اِس آیت میں جو صفات بیان ہوئی ہیں اُن کا بیک وقت کسی ذات میں جمع ہونا ہمارے ناقص فہم میں آنا ناممکن ہے۔ پھر یہ آیت قرآنِ حکیم کا واحد مقام ہے جہاں اللہ کی صفات کے درمیان حرفِ عطف ''وَ'' آیا ہے۔ گویا حتمی انداز سے واضح کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ بیک وقت اَلْاَوَّلُ بھی ہے اور

اَلْاٰخِرُ بھی، اَلظَّاهِرُ بھی ہے اور اَلْبَاطِنُ بھی۔ اِسی لئے اِس آیت کے بارے میں امام رازیؒ کے تاثرات یہ ہیں کہ :

اِعْلَمْ اَنَّ هٰذَا الْمَقَامَ مَقَامٌ غَامِضٌ عَمِیْقٌ مُهِیْبٌ

''جان لو کہ یہ مقام بڑا مشکل، گہرا، لرزا دینے والا مقام ہے۔''

- ایک عام سطح کا ذہن رکھنے والے کے لئے نبی اکرم ﷺ نے اِس آیت کے فہم کو اپنی ایک مناجات میں اِن الفاظ کے ذریعہ آسان فرما دیا :

اَنْتَ الْاَوَّلُ فَلَیْسَ قَبْلَکَ شَیْءٌ، وَاَنْتَ الْاٰخِرُ فَلَیْسَ بَعْدَکَ شَیْءٌ، وَاَنْتَ الظَّاهِرُ فَلَیْسَ فَوْقَکَ شَیْءٌ، وَاَنْتَ الْبَاطِنُ فَلَیْسَ دُوْنَکَ شَیْءٌ

''اے اللہ! تو وہ پہلا ہے کہ تجھ سے پہلے کچھ نہیں تھا، تو وہ آخر ہے کہ جس کے بعد کچھ نہیں، تو وہ ظاہر اور غالب ہے کہ جس کے اوپر کچھ نہیں اور تو وہ مخفی ہے کہ تجھ سے پرے اور تجھ سے زیادہ مخفی اور کوئی نہیں۔'' (مسلم)

- اِس آیت میں غور و فکر کرنے والوں کے لئے اللہ کی معرفت کے حصول کا حکیمانہ نکتہ پوشیدہ ہے۔ اِس نکتہ تک رسائی سے قبل یہ حقیقت پیشِ نظر رہے کہ ایک عام آدمی کے لئے معرفتِ الٰہی کے حوالے سے اولاً یہ جاننا ضروری ہے کہ اللہ ہی اُس کا اور کائنات کی ہر شے کا خالق ہے۔ پھر اُس خالق کی صفاتِ کمال کا ایک اجمالی علم حاصل ہو جائے۔ اِس کے بعد معاملہ عمل کا ہے کہ اُسی کی اطاعت کرو، اُسی کے سامنے سر جھکاؤ، اُسی سے دُعا کرو اور اُسی سے محبت کرو۔ یہ معاملہ ہے ایک ایسے انسان کا جو عام عقلی سطح کا حامل ہے۔ البتہ جو لوگ غور و فکر کرنے والے ہوتے ہیں اور فطری طور پر ایک شدید علمی پیاس اُن کے اندر موجود ہوتی ہے، وہ خالق کے وجود اور مخلوق سے اُس کے تعلق کی نوعیت جاننے کے لئے خود کو بے چین پاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی بے چینی دور کرنے کے لئے تسکین کا سامان بھی اِس آیت میں موجود ہے۔ اِس کی

وجہ یہ ہے کہ قرآنِ حکیم ھُدًی لِلنّاس ہے اور اِس میں ہر ذہنی سطح کے انسان کے لئے ہدایت موجود ہے۔

- خالق و مخلوق کے باہمی تعلق کو علم الکلام کی اصطلاح میں ''ربط الحادث بالقدیم'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ حقیقت تو سب کے نزدیک مسلّم ہے کہ کائنات بغیر کسی پیدا کرنے والے کے وجود میں نہیں آئی۔ مشکل مسئلہ یہ ہے کہ خالق و مخلوق کا باہمی تعلق کیا ہے؟ آیا خالق و مخلوق کے مابین کوئی ثنویت یا دوئی ہے کہ خالق کو جدا سمجھا جائے اور مخلوق کو جدا یا یہ کہ اِن کے مابین کوئی اور تعلق ہے؟ پھر اگر کچھ اور تعلق ہے تو وہ کیا ہے؟

- خالق و مخلوق کے باہمی تعلق کے حوالے سے پہلا فلسفیانہ تصور تو یہ پیش کیا گیا کہ جس طرح کسی بڑھئی نے لکڑی سے کرسی بنادی، اِسی طرح خالق نے مادہ سے کائنات کی مختلف اشیاء بنادیں۔ یہ تصور خالق اور مادہ دونوں کو قدیم مانتا ہے یعنی خالق کے ساتھ ساتھ مادہ بھی شروع سے موجود تھا جس سے یہ خالق نے کائنات بنائی۔ اِس اعتبار سے یہ تصور ایک گمراہی ہے اور شرک کی ایک صورت ہے۔

ایک دوسرا فلسفیانہ تصور یہ بیان کیا گیا کہ کہ خالق و مخلوق کا باہمی تعلق اِسی نوعیت کا ہے جیسے برف پگھل کر پانی بن جائے۔ اب برف کو تلاش کرنا کہ وہ کہاں ہے، ایک بے معنی سی بات ہے۔ وہ برف اب کہیں نہیں ہے بلکہ یہ پانی ہی برف ہے۔ اِسی طرح خالق نے خود تحلیل ہو کر کائنات کی شکل اختیار کر لی ہے۔ یہ نظریہ ہمہ اوست (Pantheism) کہلاتا ہے جو شرک فی الذات کی بدترین صورت ہے۔ اِس نظریہ کی رُو سے ہر شے الوہیت کی حامل بن جاتی ہے۔ ایک گمراہ کن نظریہ حلول و اتحاد کا بھی ہے کہ جیسے پانی میں شکر گھل جاتی ہے اور شکر کا علیحدہ وجود ختم ہو جاتا ہے اِسی طرح خالق اِس کائنات میں یا کسی انسان میں حلول کر گیا ہے۔ یہ سب گمراہی کی

صورتیں ہیں:

حلول و اتحاد ایں جا محال است
کہ در وحدت دوئی، عینِ ضلال است

خالق و مخلوق کے تعلق کے ضمن میں یہ مختلف تصورات دنیا میں رہے ہیں۔ سوچنے والے بہرحال سوچنے پر مجبور تھے۔ یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ انہیں سوچنا نہیں چاہیئے تھا۔ یہ بات اُن لوگوں کے لئے تو صحیح ہے کہ جن کے ذہن میں وہ سوال پیدا ہی نہیں ہوا۔ جسے پیاس لگی ہی نہ ہو اس کا معاملہ مختلف ہوگا، لیکن جسے لگ گئی ہو اُسے تو اب پانی تلاش کرنا ہوگا۔ چنانچہ جن لوگوں کے ذہنوں میں یہ مسائل کلبلا رہے ہوں، جو لوگ فلسفیانہ مزاج کے حامل ہوں اور جن کی افتادِ طبع یہ ہو کہ وہ ہر شے کی حقیقت کو جاننا چاہتے ہوں:

اے اہلِ نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

وہ اِن مسائل پر غور و فکر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور خود کو اِس معاملے میں بے بس پاتے ہیں۔ جن کے ذہن حقائق الاشیاء تک پہنچنے کے لئے بیتاب ہوتے ہیں، وہ یہ جاننے کے لئے خود کو مجبور پاتے ہیں کہ خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے مابین تعلق کی نوعیت کیا ہے؟

- خالق و مخلوق کے تعلق کی نوعیت کو سمجھنے کے لئے بے چین لوگوں کے اطمینان کے لئے ضروری ہے کہ اُن کے ذہنوں میں اُٹھنے والے سوالات کا جواب دیا جائے۔ جن مسلمان متکلمین نے ایسا کیا اُن میں سب سے پہلے نمایاں شخصیت شیخ محی الدین ابنِ عربی کی ہے۔ ابنِ عربی نے وجودِ باری تعالیٰ کو سمجھانے کے لئے فلسفۂ وحدت الوجود پیش کیا۔ اِس فلسفہ کے مطابق وجودِ حقیقی صرف اللہ کا ہی کا ہے۔ اِس وجود نے

جب تعین کی شکلیں اختیار کیں تو مختلف وجود ظہور میں آ گئے اور اِن میں اور اُس وجودِ مطلق میں ایک اعتباری یا نسبت کے اعتبار سے مغائرت پیدا ہوگئی۔ یہ صرف تعینات کا پردہ ہے ورنہ حقیقت کے اعتبار سے ماہیتِ وجود صرف ایک ہی ہے۔ یہ فلسفہ اِس قدر دقیق ہے اور اِس کی تعبیر کا معاملہ اتنا مشکل ہے کہ اِس کے لئے جو بھی الفاظ اختیار کئے جائیں وہ کچھ ایسے تلوار کی دھار پر چلنے کی مانند ہیں کہ ذرا ادھر ہو تو معاملہ ہمہ اوست کا بن جاتا ہے۔ ہمہ اوست اور وحدت الوجود کے نظریات میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ہمہ اوست کے نظریہ میں مخلوقات کے وجود کو حقیقی مانا جاتا ہے جبکہ وحدت الوجود کے فلسفہ میں حقیقی وجود صرف اللہ تعالیٰ کا تسلیم کیا جاتا ہے۔ صرف ظاہری طور پر صورت یہ ہے کہ ثنویت سامنے آتی ہے یعنی خالق اور ہے مخلوق اور ہے، عبد اور ہے معبود اور ہے۔

شیخ احمد سرہندیؒ نے وحدت الشہود کا فلسفہ پیش کر کے فلسفۂ وحدت الوجود کو زیادہ محتاط اور عام فہم کر دیا اور خطرات سے بہت حد تک بچا دیا۔ اُنہوں نے خالق و مخلوق کے ربط کو یوں بیان کیا کہ وجود تو درحقیقت ہے صرف ذاتِ باری تعالیٰ کا۔ مخلوقات، اِس وجودِ حقیقی کا سایہ یا عکس ہیں اور سائے یا عکس کا کوئی مستقل وجود نہیں ہوتا :

كُلٌّ مَافِي الْكَوْنِ وَهْمٌ اَوْ خِيَال
اَوْ عَكْسٌ فِي الْمَرَايَا اَوْ ظِلَال

''جو کچھ جہان میں ہے وہ کوئی وہم یا خیال ہے یا کسی آئینہ میں عکس ہے یا سایہ ہے۔''

غالب نے اِسی تصور کو یوں بیان کیا :

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے!

فلسفۂ وحدت الشہود کو سمجھانے کے لئے شیخ احمد سرہندیؒ نے ایک بہترین تشبیہ

اختیار کی کہ ایک لکڑی کے سرے پر کپڑا باندھ کر اُس میں تیل ڈال کر آگ لگا دی جائے۔ ایک شعلۂ جوالہ وجود میں آجائے گا۔ اب اگر اِس لکڑی کو تیزی کے ساتھ دائرے میں حرکت دی جائے تو ایک آتشی دائرہ نظر آئے گا۔ دائرہ نظر آ رہا ہے، محسوس ہو رہا ہے، مشہود ہے لیکن فی الواقع موجود نہیں :

لو شمعِ حقیقت کی ، اپنی ہی جگہ پر ہے
فانوس کی حرکت سے ، کیا کیا نظر آتا ہے

یہ ہے مثال اِس کائنات کی، اِس سلسلۂ موجودات اور کون و مکاں کی۔ کائنات اور اس میں بے شمار مخلوقات نظر آتی ہیں، محسوس ہوتی ہیں، مشہود ہیں لیکن اِن کا وجود نہیں۔ چنانچہ حضرت شیخ احمد سرہندیؒ فرماتے ہیں :

ایں از صنعتِ باری تعالیٰ است
کہ معدوم را موجود می نمایند

''یہ اللہ تعالیٰ کی شان ہے کہ اُس نے معدوم کو موجود کر کے دکھایا۔''

لوگوں کو مغالطہ ہے کہ شاید شیخ احمد سرہندیؒ ، ابنِ عربی کے فلسفۂ وحدت الوجود کو گمراہی سمجھتے ہیں۔ اُنہوں نے اختلاف کیا ہے لیکن اپنے مکتوبات میں ایک جگہ اعتراف کرتے ہیں کہ :

''میں اُس کے دسترخوان کے جھوٹے ٹکڑے کھانے والوں میں سے ہوں۔''

امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنے مشہور مکتوبِ مدنی میں تحریر فرمایا ہے کہ ابن عربیؒ کے فلسفۂ وحدت الوجود اور شیخ احمد سرہندیؒ کے فلسفۂ وحدت الشہود میں صرف ایک تعبیر کا فرق ہے ورنہ بنیادی تصور ایک ہی ہے۔

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے اپنی تصنیف ''الدین القیم'' میں ایک مثال کے ذریعہ اِس مسئلے کو بہت آسان بنا دیا ہے۔ آپ تصور کیجئے اپنے ذہن میں کسی عمارت

کا۔ یہ تصور آپ کے ذہن کی تخلیق ہے۔ آپ کے ذہن میں قائم ہے اور آپ کی توجہ پر اِس کا دارومدار ہے۔ ذرا توجہ ہٹ جائے تو اُس کا کوئی وجود نہیں۔ آپ اپنے تصور میں قائم تخلیق کے اوپر بھی ہیں اور نیچے بھی۔ دائیں بھی ہیں بائیں بھی۔ باہر بھی ہیں اندر بھی ہیں۔ آپ ہی آپ ہیں۔ آپ کے بغیر اُس تخلیق کا کا کوئی حقیقی وجود علیحدہ سے نہیں ہے۔ بالکل یہی تمثیل ہے اللہ کی اور اُس کی تخلیق کردہ کائنات کی۔ اِس تمثیل پر یہ الفاظ کتنے صادق آتے ہیں کہ ''ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دنیا تم ہی تو ہو۔'' یہ سارا سلسلہ ہمارے چاروں طرف، ہمارے اوپر، ہمارے نیچے، ہمارے اندر، ہمارے باہر، خارج میں یہ سب کچھ وجودِ باری تعالیٰ ہی تو ہے۔ اِس کائنات میں ہر آن اور ہر جگہ وہ موجود ہے۔ اُس کی متعین شانیں بھی ہیں، اُن متعین شانوں کا ارتکاز کہیں ہوسکتا ہے۔ اُس کی تجلیات کا ظہور کسی خاص Time & Space کمپلیکس میں بھی ہوسکتا ہے، لیکن جہاں تک ذاتِ باری تعالیٰ کا تعلق ہے هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وہی اوّل ہے وہی آخر، وہی ظاہر ہے، وہی باطن، بس وہ ہی وہ ہے۔

- هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ میں اول وآخر کی صفات سے زمان (Time) کا احاطہ ہورہا ہے۔ اِس سلسلۂ کون ومکان کا اول بھی اللہ ہے آخر بھی وہی ہے۔ اول وآخر کے الفاظ زمانِ مسلسل کی دو انتہاؤں کو بیان کررہے ہیں۔ اِن دو انتہاؤں کے مابین مکان (Space) کا پھیلاؤ ہے۔ اِس پھیلاؤ کا ظاہر بھی اللہ ہے اور باطن بھی وہی ہے۔ معلوم ہوا بس وہی وہ ہے۔ یہ ہے وہ مقام جس کو تعبیر کیا صوفیا نے کہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا مفہوم ہے لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰهُ - کوئی موجود نہیں سوائے اللہ کے۔
- هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ کا مفہوم سمجھنے کے بعد وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ

عَلِيْمٌ کا مفہوم خود بخود واضح ہوگیا۔ جب وہی وہ ہے تو کسی شے سے اُس کی بے خبری کا کیا سوال؟ وہ ہر شے کا علم رکھتا ہے۔ جب وہ ہر آن اور ہر جگہ موجود ہے تو کسی درجہ میں بھی کہیں کوئی وسوسہ، کوئی خیال، کوئی گمان، کوئی مغالطہ، کوئی احساس وارد نہ ہو کہ کوئی شے اُس کے علم میں نہیں۔ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ۔ یہاں پھر دیکھئے کہ وہی لفظ کل ہے اور اِسی لفظ کل کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کی صفت علم کا بھی بیان ہورہا ہے کہ اللہ ہر شے کا علم رکھتا ہے خواہ ہمیں اِس کا شعور وادراک ہو یا نہ ہو۔

- بہت سے فلسفی اِس بات پر متفق ہیں کہ اللہ عالمِ کُلیات ہے عالمِ جزئیات نہیں۔ بڑے بڑے قانون اور ضوابط تو اُس کے علم میں ہیں لیکن چھوٹی چھوٹی تفصیلات سے اُسے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ تو اپنی ذات میں مگن ہے۔ قرآن اِس گمراہی کی نفی بار بار اِن الفاظ سے کرتا ہے کہ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ۔
- آیت 2 کے آخر میں الفاظ تھے وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ اور اِس آیت 3 کے آخر میں الفاظ ہیں وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ۔ اللہ کی یہی دو صفات ہیں جن پر قرآنِ حکیم میں بہت زور دیا گیا ہے کہ وہ ہر شے پر قادر ہے اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ اِس کی ایک حکمت یہ ہے کہ درحقیقت اِنہی دو اعتبارات سے شیطان انسان کے ذہن میں وسوسہ اندازی کرتا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ جب انسان مرجائے، اُس کی ہڈیاں گل سڑ جائیں، اُس کے ایٹمز بھی تحلیل ہوچکے ہوں، نیوٹرون اور پروٹون بھی منتشر ہو گئے ہوں، اُسے دوبارہ زندہ کیا جاسکے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان کا ہر ہر عمل اور عمل کی جزیات بھی اللہ کے علم میں ہوں اور اُنہیں محفوظ کیا جارہا ہو۔ اِن دونوں وسوسوں کا قرآنِ حکیم بار بار ازالہ کرتا ہے اِن الفاظ سے کہ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ -- وہ ہر شے پر قدرت رکھتا ہے اور هُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ -- وہ ہر شے کا علم رکھنے والا ہے۔

- تقدیر پر ایمان اللہ کی اِن دو صفات یعنی عَلٰی کُلِّ شَیءٍ قَدِیْرٌ اور بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ کو ماننے کا منطقی نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ مخلوقات میں سے کسی کے بس میں نہیں کہ بغیر اُس کی اجازت کے محض اپنے ارادے سے کچھ کر سکے۔ ہم جو کچھ کرتے ہیں وہ اللہ کے اذن اور اُس کی توفیق سے کرتے ہیں۔ اِس دنیا میں جو کچھ ظہور پذیر ہوتا ہے، خواہ وہ کسی کو بھلا لگے یا بُرا، اللہ کے اذن ہی سے ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اللہ کا عاجز و لاچار ہونا لازم آتا ہے۔ پھر اللہ ہر شے کو جانتا ہے اور ہمیشہ سے جانتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اِس پوری کائنات میں ماضی میں کیا ہوا یا حال میں کیا ہو رہا ہے یا مستقبل میں کیا ہوگا۔ یہ سب حالات اُس کے علمِ قدیم میں پہلے سے موجود ہیں۔ کل مجھے جو کچھ کرنا ہے وہ اللہ کے علم میں ہے۔ البتہ اِس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جو کچھ میں کل کرنے والا ہوں وہ اللہ کے علم میں ہے، لہٰذا میں مجبور ہوں کہ وہ کروں۔ اللہ کا مستقبل کے واقعات کا علم (**Pre-Knowledge**) ہمارے لئے جبرِ محض (**Pre-Determination**) کی دلیل نہیں۔ ہمیں عمل کرتے ہوئے ایک اختیار محسوس ہوتا ہے، بقول فانی بدایونی :

فانی ترے اعمال ہمہ تن جبر ہی سہی
سانچے میں اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہیں

☆ آیت : **4** :

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ -- وہی ہے جس نے بنائے آسمان اور زمین چھ دن میں -- ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ -- پھر وہ بیٹھا تخت پر -- یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْهَا -- وہ جانتا ہے جو داخل ہوتا ہے

زمین میں اور جو نکلتا ہے اُس سے -- وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْهَا -- اور جو اترتا ہے آسمان سے اور جو چڑھتا ہے اُس کی طرف -- وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ -- اور وہ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں کہیں ہو -- وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ

اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اُس کو دیکھنے والا ہے۔

- چھ دنوں میں آسمانوں اور زمین کی تخلیق کا ذکر قرآنِ حکیم میں بار بار آیا ہے۔ اِس کائنات میں اللہ کے دو عالم کام کر رہے ہیں ایک عالمِ امر اور دوسرا عالمِ خلق۔ سورۃ الاعراف آیت **54** میں ان دونوں عالموں کا ذکر ہے یعنی اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ہے۔ عالمِ امر کی شان یہ ہے کہ اُس میں وقت کا عنصر نہیں اور اللہ کے احکام کا معاملہ كُنْ فَیَكُوْنُ کی شان کے ساتھ ظہور میں آتا ہے :

اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ (یٰسٓ : **82**)

''بے شک اُس (اللہ) کے امر کا معاملہ تو یہ ہے کہ جب وہ کسی شے کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے ہو جا اور وہ شے ہو جاتی ہے۔''

عالمِ خلق کا معاملہ برعکس ہے۔ یہاں اشیاء کے تکمیل پانے میں وقت لگتا ہے۔ بیج سے درخت بننے میں وقت لگتا ہے۔ جب آسمانوں اور زمین کی تخلیق ہوئی تو یہ تخلیق بھی چھ دنوں میں مکمل ہوئی۔

- چھ دن کون سے ہیں؟ ۔ ہم اِن کی حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔ ہم تو اُس دن سے واقف ہیں جس میں زمین سورج کے اعتبار سے اپنے محور کے گرد گردش مکمل کرتی ہے۔ جب ابھی زمین و آسمان بنے ہی نہیں تھے تو اُس وقت، دن کا کیا تصور تھا ہم نہیں جان سکتے۔ ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ اللہ نے چھ مراحل میں زمین اور آسمان بنائے۔
- آسمانوں اور زمین کی تخلیق کے ذکر کے بعد اِس آیت میں فرمایا گیا ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ -- پھر وہ بیٹھا تختِ حکومت پر۔ گویا کائنات کا خالق بھی اللہ ہے اور

حاکم بھی اللہ۔مختلف اصطلاحات کے ساتھ کائنات کے ایک خالق کے ہونے کا تصور تو کئی فلاسفی پیش کرتے ہیں لیکن اِس کے ساتھ ساتھ وحی الٰہی کی رہنمائی سے محروم ہونے کی وجہ سے گمراہ کن نظریات بھی وابستہ کر دیتے ہیں۔یہ بھی ایک گمراہ کن فلسفیانہ تصور ہے کہ ایک خالق نے کائنات کو پیدا کیا اور اِس کے لئے کچھ طبعی و کیمیائی قوانین (phisical and chemical laws) بنانے کے بعد اِسے چھوڑ دیا۔اب یہ کائنات اِن قوانین کے تحت خود بخود رواں دواں ہے۔اِس بات کو یوں سمجھئے کہ آپ نے زوردار ٹھوکر ایک فٹ بال کو لگا دی ہے۔اب وہ فٹ بال جا رہی ہے۔آپ کا اب اُس فٹ بال سے کوئی تعلق نہیں۔آج کے ایک سائنس زدہ ذہن (scientific mind) کا یہ تصور خالق اور کائنات کے بارے میں ہے۔اِس قسم کے ذہن کے لئے یہ تسلیم کرنا مشکل ہے کہ کائنات کے ہر معاملہ میں اور ہر آن و ہر لحظہ اللہ ہی کی مرضی اور اللہ ہی کا فیصلہ جاری و ساری ہے۔اِس آیت میں اللہ نے اِس غلط تصور کی نفی کر دی کہ اللہ نے صرف کائنات نہیں بنائی بلکہ وہ ہی تختِ حکومت پر بیٹھ کر کائنات کے مختلف امور کی تدبیر بھی کرتا ہے اور وہی اِس کائنات کے نظام کو چلا بھی رہا ہے۔یہ کائنات اپنے ہر معاملہ کے لئے اللہ کی توجہ اور اُس کے حکم کی محتاج ہے۔

- اِس آیت میں اللہ کی صفتِ علم کو پھر دیکھئے کہ وہ کس شان سے آ رہی ہے۔ **يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا** -- وہ جانتا ہے جو داخل ہوتا ہے زمین میں اور جو نکلتا ہے اُس سے۔پانی کا ہر قطرہ جو زمین میں جذب ہوتا ہے، درختوں سے گرنے والے پھولوں سے وہ ہر بیج جو زمین کے اندر پڑتا ہے، اللہ کے علم میں ہے۔ایک ایک بیج کو اللہ پالتا ہے۔پھر کسی بیج سے کونپل کا کوئی سرا زمین سے نہیں نکلتا مگر وہ اللہ کے علم میں ہوتا ہے۔یہ سب از خود نہیں ہو رہا اللہ کی مشیت سے ہو رہا ہے۔**وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا** -- اور (اللہ جانتا ہے) جو اترتا ہے آسمان

سے اور جو چڑھتا ہے اُس کی طرف۔آسمان سے نازل ہونے والے بارش کے ہر قطرے اور اللہ کا حکم لے کر اترنے والے ہر فرشتہ کا اللہ کو علم ہے۔اِسی طرح آسمان کی طرف اُٹھنے والے بخارات اور آسمان کی طرف جانے والے فرشتوں سے سے بھی اللہ باخبر ہے۔صرف ایک خالق کو مان لینا کافی نہیں بلکہ اُس اللہ کو ماننا مطلوب جس کی اعلیٰ صفات سے قرآنِ حکیم ہمیں متعارف کراتا ہے۔

- **وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ** -- اور وہ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں کہیں ہو۔اللہ کی معیت کی دو شانیں ہیں۔ایک ہے عمومی معیت یعنی اللہ ہر جگہ ہے اور ہر انسان کے ساتھ ہے۔اُس کی موجودگی کی کیفیت کو ہم نہیں جان سکتے۔ہم یہ نہیں جانتے وہ کیسے موجود ہے لیکن وہ کسی خاص جگہ یا سمت میں محدود نہیں ہے۔سورۂ بقرۃ آیت **115** میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ اَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ

''مشرق و مغرب سب اللہ کے ہیں۔تم جہاں بھی رخ کرو گے موجود ہو گا اللہ۔''

ذاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں ایک عام تصور یہ ہے کہ وہ کسی ایک خاص جگہ پر موجود ہے اور اُس کا وجود کائنات میں ہر جگہ نہیں ہے۔**وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ** کے بارے میں بالعموم یہ تصور ہے کہ وہ صرف اپنی صفات کے اعتبار سے ہمارے ساتھ ہے یعنی ہمیں دیکھ رہا ہے اور ہماری باتیں سن رہا ہے۔یہ تصور محض ایک تاویل ہے۔یہ تاویل درحقیقت اِن الفاظ کا حق ادا نہیں کر رہی کہ **وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ** -- اور وہ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں کہیں ہو۔وہ ہمارے ساتھ کیسے ہے؟ یہ ہم نہیں جانتے، لیکن وہ ہمارے ساتھ ہر جگہ اور ہر آن موجود ہے۔وہ عرش پر متمکن ہے لیکن صرف وہیں محدود نہیں۔وہ ہر جگہ ہمارے ساتھ ہے۔

دوسری ہے اللہ کی معیتِ خصوصی جو اللہ کے نیک بندوں کو حاصل ہوتی ہے۔جیسا کہ

قرآنِ حکیم میں آیا اِنَّ اللّٰہَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ ، اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصَّابِرِیْنَ ، اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِیْنَ ھُمْ مُّحْسِنُوْنَ ۔ جیسے کہ نبی اکرم ﷺ نے غارِ ثور میں حضرت ابوبکر صدیق ؓ سے عین اُس وقت جب کہ دشمن غار کے دہانے پر پہنچ گیا تھا فرمایا لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہ مَعَنَا -- غم نہ کرو اللہ ہمارے ساتھ ہے (التوبہ : **40**)۔ اِسی طرح حضرت موسیٰ ؑ جب مصر سے بنواسرائیل کو لے کر نکلے تو فرعون نے اپنے لشکروں سمیت آپ کا پیچھا کیا۔ ایک وقت ایسا آیا کہ فرعون کا لشکر قریب آ پہنچا اور آگے دریا تھا، ایسے میں حضرت موسیٰ ؑ نے اطمینان سے فرمایا اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَھْدِیْنِ -- میرے ساتھ میرا رب ہے وہ عنقریب میرے لئے راستہ نکال دے گا (الشعراء :**62**)۔

- وَھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَ مَا کُنْتُم کا لازمی نتیجہ ہے وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ یعنی جب اللہ ہر جگہ موجود ہے تو وہ عینی شاہد ہے ہر عمل کا۔ وہ دیکھنے والا ہے اُسے جو کچھ کہ تم کر رہے ہو۔ اُسے کسی report کی احتیاج نہیں ہے۔ فرشتے جو نامۂ اعمال تیار کر رہے ہیں وہ صرف تم پر اتمامِ حجت کے لئے ہے ورنہ اللہ تو بذاتِ خود دیکھ رہا ہے کہ کون کیا کر رہا ہے؟

☆ آیت : **5** :

لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ -- اُسی کے لئے ہے بادشاہت آسمانوں اور زمین کی -- وَاِلَی اللّٰہِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿﴾ اور اللہ ہی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں تمام معاملات۔

- لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کے الفاظ آیت نمبر **2** میں اِس سے قبل آ چکے ہیں۔ اِن الفاظ کو دوبارہ اِس لئے لایا گیا کہ اللہ کو ماننے والوں کی اکثریت اللہ کو خالق تو مان لیتی ہے لیکن بادشاہ مان کر اُس کے احکامات کے نفاذ کے لئے تیار نہیں

ہوتی۔ درحقیقت اللہ کی بادشاہت اور اُس کی حاکمیت پر مبنی نظام قائم کرنے کا تصور خلافت راشدہ کے بعد رفتہ رفتہ ذہنوں سے محو ہوتا گیا۔ جب خلافت ختم ہوئی تو ملوکیت کا آغاز ہو گیا۔ اُس وقت اللہ کی حاکمیت کے قیام کے لئے کچھ کوششیں ہوئیں لیکن دنیوی اعتبار سے یہ کوششیں کامیاب نہ ہو سکیں۔ اِس کے بعد مسلمانوں نے ذہناً تسلیم کر لیا کہ اب یہ حکومت اور ریاست کا معاملہ تو قوت کے بل پر چلے گا۔ جس کے پاس طاقت ہوگی وہ حکومت کرے گا۔ اللہ کی حکومت کا تصور ہی مسلمانوں کے ذہن سے نکل گیا اور دین کو محض چند عقائد، عبادات اور رسومات تک محدود سمجھ لیا گیا۔ اب دین کا تصور صرف یہ رہ گیا کہ اللہ کو ایک مانو، اللہ کے لئے نماز پڑھو، روزے رکھو، زکوٰۃ دو اور اُس کے گھر کا حج کرو۔ اِن چھ آیات میں دو مرتبہ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کے الفاظ کا آنا ظاہر کرتا ہے کہ قرآنِ حکیم اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے تصور کو کتنی اہمیت دیتا ہے۔ انسان خود حاکم بن کر بیٹھ جانا ایک بہت بڑا فساد اور اللہ کے خلاف بغاوت ہے۔ جو اللہ کا وفادار ہے اُس کا فرض ہے کہ اِس بغاوت کا قلع قمع کرے تاکہ اللہ کا حاکمیت کا حق بحال (**restore**) ہو اور زمین پر اللہ کی حاکمیت بالفعل قائم ہو جائے۔

- اِس آیت کے اگلے حصّے میں خبردار کیا گیا اِلَی اللّٰہِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ -- اللہ ہی کی طرف لوٹائے جائیں گے تمام معاملات۔ اللہ کے بادشاہ ہونے کا ایک منطقی نتیجہ ہے کہ تمام معاملات اُسی کی عدالت میں پیش کیے جائیں اور آخری فیصلہ کا اختیار اُسی کو حاصل ہو۔ گویا یہ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کے درمیان منطقی ربط ہے۔ یہاں اسلوب مجہول کا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ خواہی نہ خواہی، پسند ہو نا ہو، تم چاہو یا نہ چاہو لیکن تمام معاملات اللہ کے دربار میں پیش ہوں گے۔ اُس روز کی شرمندگی سے محفوظ رہنے کے لئے ضروری ہے ہے کہ دنیا میں اللہ کو بادشاہِ حقیقی سمجھ کر

اُس کے تمام احکامات پر عمل کرنے کی کوشش کی جائے۔

☆ آیت : 6 :

يُوْلِجُ الَّيْلَ فِى النَّهَارِ -- وہ داخل کرتا ہے رات کو دن میں -- وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِى الَّيْلِ -- اور وہ داخل کرتا ہے دن کو رات میں -- وَهُوَ عَلِيْمٌ م بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿﴾ اور وہ واقف ہے اُن رازوں سے جو سینوں میں ہیں۔

◄ اِس آیت میں یہ حقیقت واضح کی گئی کہ یہ سلسلۂ روز و شب اللہ تعالیٰ کی آیات میں سے ایک عظیم آیت ہے۔ یہ رات اور دن کا نظام خود بخود نہیں چل رہا بلکہ یہ اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ سورۂ قصص آیات **71 - 73** میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ ط اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ﴿﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ ط اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿﴾ وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿﴾

''(اے نبی ؐ) پوچھیے کیا تم دیکھتے ہو اگر اللہ رات کو تم پر مسلسل طاری کر دے روزِ قیامت تک کے لئے تو اللہ کے سوا کون سا معبود ہے جو تمہارے لئے دن کی روشنی لا سکے؟ کیا تم سنتے نہیں ہو؟ (اے نبی ؐ) پوچھیے کیا تم دیکھتے ہو اگر اللہ دن کو تم پر مسلسل جاری کر دے روزِ قیامت تک کے لئے تو اللہ کے سوا کون سا معبود ہے جو تمہارے لئے رات کو لا سکے جس میں تم سکون حاصل کرتے ہو؟ کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟ یہ اُس (اللہ) کی رحمت میں سے ہے کہ اُس نے تمہارے لئے دن اور رات بنائے تا کہ تم سکون حاصل کرو رات میں اور اللہ کے فضل میں سے تلاش کرو دن میں اور تا کہ تم شکر کرو''۔

يُوْلِجُ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ پروتا ہے رات کو دن میں اور پروتا ہے دن کو رات میں۔ رات اور دن کا یہ نظام گویا کہ ایک ایسی تسبیح کے مانند ہے جس میں سیاہ اور سفید دانے ایک دوسرے کے بعد پرو دیئے گئے ہوں۔ سیاہ دانہ گرا تو یہ رات ہے اور سفید دانہ گرا تو یہ دن ہے، بقول اقبال :

مری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں
میں اپنی تسبیحِ روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ

يُوْلِجُ کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ کبھی دن بڑھتا ہے اور رات گھٹ جاتی ہے، گویا کہ اللہ دن کو رات میں داخل کر رہا ہے۔ پھر کبھی رات بڑھتی ہے اور دن گھٹتا ہے، گویا کہ اللہ رات کو دن میں داخل کر رہا ہے۔

◄ وَهُوَ عَلِيْمٌ م بِذَاتِ الصُّدُوْرِ کے الفاظ کے ذریعہ اِن آیات میں تیسری بار اللہ تعالیٰ کی صفت علم پر زور دیا گیا۔ یہاں اشارہ اصل میں محاسبۂ اخروی کی طرف ہے جس روز حُصِّلَ مَا فِى الصُّدُوْرِ (جانچا جائے گا جو کچھ سینوں میں ہے) کا معاملہ ہوگا۔ اللہ جانتا ہے جو کچھ سینوں کے اندر ہے یعنی اللہ اُن نیتوں اور ارادوں سے واقف ہے جن پر اعمال کا دارومدار ہوتا ہے۔

یہاں وہ چھ آیات ختم ہوئیں جن کے بارے میں عرض کیا گیا تھا کہ ذات وصفاتِ باری تعالیٰ کا بیان انتہائی جامعیت کے ساتھ، بہت سے مختلف پہلوؤں کو اپنے اندر سموئے ہوئے اور بعض اعتبارات سے اعلیٰ ترین علمی سطح پر اِن آیات میں آیا ہے۔

منتخب نصاب حصّہ ششم

سورۂ حدید حصّہ دوم : آیات 7 تا 11

دینِ اسلام کے تقاضے

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ O بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ O
اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَکُمْ مُّسْتَخْلَفِیْنَ فِیْہِ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ
وَاَنْفَقُوْا لَھُمْ اَجْرٌ کَبِیْرٌ (7) وَمَا لَکُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالرَّسُوْلُ یَدْعُوْکُمْ
لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّکُمْ وَقَدْ اَخَذَ مِیْثَاقَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (8) ھُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ عَلٰی
عَبْدِہٖ اٰیٰتٍۢ بَیِّنٰتٍ لِّیُخْرِجَکُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ وَاِنَّ اللّٰہَ بِکُمْ لَرَءُوْفٌ
رَّحِیْمٌ (9) وَمَا لَکُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلِلّٰہِ مِیْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
لَا یَسْتَوِیْ مِنْکُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ اُولٰٓئِکَ اَعْظَمُ دَرَجَۃً مِّنَ الَّذِیْنَ
اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقَاتَلُوْا وَکُلًّا وَّعَدَ اللّٰہُ الْحُسْنٰی وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ (10)
مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗ وَلَہٗ اَجْرٌ کَرِیْمٌ (11)

- سورۂ حدید کا دوسرا حصہ پانچ آیات یعنی آیات 7 تا 11 پر مشتمل ہے۔ اِس حصے میں بڑی جامعیت کے ساتھ کہ دین کے کل تقاضے صرف دو الفاظ ''ایمان'' اور ''انفاق'' کے حوالے سے بیان کیے گئے ہیں۔
- سورۂ حدید کے پہلے حصہ میں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا بیان آیا تھا۔ اِس حصہ میں دین کے تقاضے کچھ اِس طرح سامنے آئے ہیں کہ کوئی مانے یا نہ مانے اور کسی کو شعور ہو یا نہ ہو،

یہ تو حقیقت ہے کہ کائنات کا ایک خالق ہے، کائنات کی ہر شے اُس کی تسبیح کر رہی ہے، وہی کائنات کا بادشاہ اور مالک ہے جو تختِ حکومت پر متمکن ہے، ہر ہر شے اُس کے علم میں ہے، ہر ہر لحظہ اُسی کا حکم جاری وساری ہے اور انسانوں کے نفع ونقصان اور کامیابی وناکامی کا کل اختیار اُسی کو حاصل ہے۔ لہٰذا فوز وفلاح اور کامیابی صرف اُن کے لئے ہے جو اللہ کو پر ایمان لا کر اُسی کو مطلوب ومقصود بنالیں اور اُس کی راہ میں اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے آمادہ ہو جائیں۔

نحو میں یوں کہیں گے سورۂ حدید کا پہلا حصہ کلامِ خبریہ کی صورت میں ہے کہ ایسا ہے اور ایسا ہو رہا ہے۔ اب دوسرے حصہ میں کلامِ انشائیہ آرہا ہے۔ انسان کی خیر اِسی میں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرے اور اُس کے احکامات پر عمل کرنے کے لئے اپنی ساری صلاحیتیں لگا دے کھپا دے۔

- سورۂ حدید کے اِس حصہ میں حسنِ ترتیب اور حسنِ توازن کے ساتھ انتہائی مرتب انداز میں دین کے تقاضے بیان کیے گئے ہیں۔ پہلی آیت میں جامعیت کے ساتھ دین کے جملہ تقاضوں کو دو الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اِس کے بعد اِن میں سے ہر ایک تقاضے پر دو دو آیات آرہی ہیں۔ ایک ایک آیت میں ذرا جھنجھوڑنے اور ملامت کا انداز ہے اور ایک ایک آیت میں ترغیب وتشویق کے اسلوب میں اِن تقاضوں کی ادائیگی کی طرف متوجہ کیا گیا۔ پہلی آیت میں تقاضوں کے بیان میں اجمال ہے اور بعد میں اِن کی تفصیل ہے۔

☆ آیت : 7 :

اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ -- ایمان لاؤ اللہ پر اور اُس کے رسولؐ پر -- وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَکُمْ مُّسْتَخْلَفِیْنَ فِیْہِ -- اور خرچ کرو ہر اُس شے میں سے جس پر تمہیں عارضی اختیار دیا گیا ہے -- فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَاَنْفَقُوْا لَھُمْ اَجْرٌ کَبِیْرٌ ﴿﴾ جو لوگ تم

میں سے ایمان لائے اور خرچ کرتے رہے اُن کے لئے بڑا ثواب ہے۔

- اِس آیت میں دین کے دو تقاضے بیان ہوئے ہیں ایمان اور انفاق۔منتخب نصاب کے پہلے حصہ میں دین کے تقاضے چار الفاظ میں بیان ہوئے تھے یعنی ایمان ،عمل صالح ،تواصی بالحق اور تواصی بالصبر ۔تواصی بالحق کے لئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یا دعوت الی اللہ کے الفاظ بھی آ گئے تھے۔منتخب نصاب کے چوتھے حصہ کے تیسرے سبق سورہ ٔصف میں دین کے تقاضے دو اصطلاحات میں بیان کیے گئے یعنی ایمان اور جہاد فی سبیل اللہ۔ایمان جب حقیقی ہوگا تو اِس میں عمل آپ سے آپ آ جائے گا۔قانونی سطح پر ایمان اور عمل جدا ہیں۔حقیقت کی سطح پر یہ دونوں ایک وحدت ہیں۔اِسی طرح جہاد فی سبیل اللہ،تواصی بالحق اور تواصی بالصبر دونوں کا مجموعہ ہے۔سورہ ٔحدید کی اِس آیت میں بھی دین کے تقاضے دو ہی اصطلاحات میں ہیں یعنی ایمان اور انفاق۔گویا یہاں انفاق کی اصطلاح جہاد کی اصطلاح کے مترادف کے طور پر آئی ہے۔
- اِس آیت میں دین کا پہلا تقاضا آیا کہ ایمان لاؤ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ پر۔یہ بات اِس سے قبل ہمارے سامنے آ چکی ہے کہ اِس سورۃ میں خطاب کا رُخ صرف مسلمانوں کی طرف ہے۔گویا مسلمانوں سے کہا جا رہا کہ ایمان لاؤ جیسا کہ ایمان لانے کا حق ہے۔تمہیں ''اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ''یعنی زبانی اقرار کی بنیاد پر قانونی ایمان تو حاصل ہے لیکن اب ''تَصْدِیْقٌ بِالْقَلْبِ''یعنی یقینِ قلبی کے حصول کی کوشش کر کے ایمانِ حقیقی سے باطن کو منور کرو۔یہ وہی انداز ہے جو آیا سورہ ٔنساء کی آیت **136** میں :

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ

''اے اہلِ ایمان! ایمان لاؤ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ پر۔''

پھر سورہ ٔصف آیات **10 - 11** میں بھی اِسی اُسلوب کو اختیار کیا گیا کہ :

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿﴾ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو کیا میں تمہیں ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں بچا لے دردناک عذاب سے۔ایمان لاؤ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے۔یہ تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم جان لو۔''

گویا دین کا پہلا تقاضا ہے ایمانِ حقیقی کا حصول۔ایسا ایمان جو انسان کا حال بن جائے اور انسان کے سیرت و کردار میں نظر آئے۔یہ ایمان کیسے حاصل ہوگا؟اِس کی وضاحت آگے آیت **9** میں آ رہی ہے۔

- ایمان کے حوالے سے یہاں صرف دو ایمانیات کا ذکر ہے یعنی توحید اور رسالت۔توحید تو تمام ایمانیات کی جڑ اور بنیاد ہے۔رسالت پر ایمان کا مفہوم ہی یہ ہے کہ اُن تمام باتوں کی تصدیق کرنا جو بیان فرمائیں اللہ کے رسول ﷺ نے۔گویا باقی تمام ایمانیات بھی ایمان بالرسالت میں شامل ہو گئے۔
- اِس آیت میں دین کا دوسرا تقاضا بیان ہوا **وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ** - اور خرچ کرو ہر اُس شے میں سے جس پر تمہیں عارضی اختیار دیا گیا ہے۔آگے چل کر آیت **10** میں واضح ہوگا کہ خرچ کرنے سے مراد ہے انفاق فی سبیل اللہ یعنی اللہ کے دین کی سر بلندی کے لئے خرچ کرنا۔عام طور پر خیال ہے کہ لفظِ انفاق سے مراد صرف مال خرچ کرنا ہے۔یہ خیال اِس لئے پیدا ہوا کہ اکثر و بیشتر جہاں قرآنِ حکیم میں مال خرچ کرنے کی تاکید آئی ہے وہاں انفاق کا لفظ آیا ہے۔یہاں یہ لفظ وسیع معنی میں آیا ہے یعنی خرچ کرو ہر وہ شے جس پر اللہ نے تمہیں خلافت یعنی عارضی

اختیار دیا ہے۔ گویا حکم دیا جارہا ہے کہ اپنی جسمانی صلاحیتوں اور قوتوں کو، اپنے مال واسباب اور وسائل و ذرائع کو اور اپنی اولاد کو اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے لگا دو۔ اِس سے پہلے ہم سمجھ چکے ہیں کہ یہاں انفاق کی اصطلاح جہاد کی اصطلاح کے مترادف کے طور پر آئی ہے۔ جس طرح جہاد مال اور جان دونوں سے ہوتا ہے اِسی طرح انفاق بھی مال وجان دونوں ہی کا کرنا ہوگا۔

- اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ اپنا سارا مال لگا دو۔ اللہ یہ بھی نہیں چاہتا کہ اپنے جسم اور جان کی ساری قوتیں اور صلاحیتیں ہماری راہ میں لگا دو، بلکہ اُس کا مطالبہ یہ ہے کہ اَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ - جن جن چیزوں میں تمہیں عارضی اختیار عطا کیا گیا ہے اُن میں سے ہماری راہ میں لگاؤ۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کی راہ میں " کتنا؟" لگایا جائے۔ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا اعلیٰ ترین درجہ سورۂ بقرۃ آیت **219** میں بیان ہوا :

وَ يَسْئَلُوْنَكَ مَا ذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَا

" (اے نبی ﷺ!) وہ آپؐ سے پوچھتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں؟ کہہ دیجیے جو بھی تمہاری ضرورت سے زائد ہو"۔

دین کی سربلندی کی جدوجہد اُسی وقت کامیاب ہوگی جب ہماری ایک قابلِ ذکر تعداد ایمان کے اِس درجہ پر پہنچ جائے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اُسوہ پر عمل کرتے ہوئے اپنا سب کچھ اللہ کے دین کے لئے وقف کردے۔ ہاں زندگی کو برقرار رکھنا بھی ضروری ہے کہ یہ اللہ کی عطا کردہ ایک نعمت ہے اور اسے اِس لئے برقرار رکھنا ہے تاکہ اللہ کے دین کی اقامت محنت اور جدوجہد کی جاسکے۔ لہٰذا اپنی اور اپنے اہل وعیال کی گذر اوقات کے لئے صرف اتنا لگایا جائے کہ جس سے اُن کی بنیادی ضروریات پوری ہوجائیں۔ گویا زندگی minimum subsistence level پر

گزارتے ہوئے باقی سب کچھ اللہ کی راہ میں لگا دیا جائے، بقول اقبال :

جوحرفِ قُلِ العَفو میں پوشیدہ تھی اب
اس دَور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار!

- اِس آیت میں مُّسْتَخْلَفِيْنَ کا لفظ دراصل اسم المفعول ہے جس کا مفہوم ہے وہ لوگ جنہیں خلافت دی گئی۔ یہ لفظ واضح کررہا ہے کہ ہماری کوئی حیثیت ہے ہی نہیں۔ ہر شے کا اصل مالک اللہ ہے۔ اُس نے ہمیں بطورِ امانت اور برائے امتحان کچھ چیزوں پر عارضی اختیار دیا ہے۔ اِن میں ہمارا جسم، توانائی، علم، ذہانت وفطانت، دُور بینی و دُور اندیشی، وقت، صحت، قوتِ کار، عمر، خاص طور پر جوانی، مال واسباب، گھر، سواری، اولاد وغیرہ شامل ہیں۔ روزِ قیامت سوال ہوگا کہ ہم نے اِن نعمتوں کو اللہ کی مرضی کے مطابق اُس کی راہ میں لگایا یا نہیں۔ ارشادِ نبوی ﷺ ہے :

لَا تَزُوْلُ قَدَ مَا ابْنِ اٰدَمَ يَوْمَ الْقِيَا مَةِ حَتّٰى يُسْئَلَ عَنْ خَمْسٍ عَنْ عُمُرِهٖ
فِيْمَا اَفْنَاهُ وَ عَنْ شَبَابِهٖ فِيْمَا اَبْلَاهُ وَ عَنْ مَّالِهٖ مِنْ اَيْنَ اكْتَسَبَهٗ
وَ فِيْمَا اَنْفَقَهٗ وَ مَا ذَا عَمِلَ فِيْمَا عَلِمَ

''روزِ قیامت ابنِ آدم کے قدم ہل نہ سکیں گے جب تک اُس سے پانچ باتوں کے بارے میں پوچھ نہ لیا جائے۔ زندگی کے بارے میں کہ کہاں لگادی، جوانی کے بارے میں کہ کہاں کھپادی، مال کے بارے میں کہ کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا اور جو علم حاصل کیا اُس پر کتنا عمل کیا۔'' (ترمذی)

اِسی طرح آپ ﷺ کا ارشاد ہے :

كُلُّكُمْ رَاعٍ وَ كُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِيَّتِهٖ

''تم میں سے ہر اک نگران ہے اور اُس سے اس کے ماتحتوں کے بارے میں

باز پرس ہوگی۔'' (بخاری)

- آیت کے دوسرے حصہ میں فرمایا فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَاَنْفَقُوْا لَھُمْ اَجْرٌ کَبِیْرٌ ۔ جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور خرچ کرتے رہے اُن کے لئے بڑا اجر ہے۔ ہمارے پاس جو کچھ ہے اللہ ہی کا عطا کردہ ہے۔ مال، اولاد، گھر، سواری، جسمانی قوت، ذہانت وغیرہ۔ اگر ہم یہ سب اللہ کے دین کے لئے لگا دیں تو کوئی بڑی بات نہیں :

جان دی ، دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

لیکن اِس کے باوجود اللہ تعالیٰ ایمان لانے والوں اور اپنی راہ کے لئے مال و اسباب لگانے والوں کو بڑے اجر کی خوشخبری دے رہا ہے :

اِنَّ اللّٰہَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَی النَّاسِ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَھُمْ لَا یَشْکُرُوْنَ ﴿﴾

''بے شک اللہ لوگوں پر مہربان ہے لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔'' (یونس :60)

آیت : 8 :

وَمَا لَکُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ -- اور تمہیں کیا ہوا ہے کہ ایمان نہیں لاتے اللہ پر؟ -- وَالرَّسُوْلُ یَدْعُوْکُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّکُمْ -- حالانکہ رسولؐ تمہیں دعوت دیتے ہیں کہ ایمان لاؤ اپنے رب پر -- وَقَدْ اَخَذَ مِیْثَاقَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿﴾ اور (رسولؐ) لے چکے ہیں تم سے عہد اگر تم (واقعی) مومن ہو۔

- اِس آیت میں دین کے پہلے تقاضے یعنی ایمان کے حوالے سے جھنجھوڑا جا رہا ہے۔ فرمایا جا رہا ہے کہ تمہارا ایمان سیرت و کردار میں نظر کیوں نہیں آ رہا۔ اللہ کے نزدیک تو ایمان والے وہ ہیں جن کا نقشہ سورۂ حجرات کی آیت 15 میں یوں کھینچا گیا :

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجٰھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ؕ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴿﴾

''مومن تو بس وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لائے، پھر شک میں نہ پڑے اور اُنہوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا اپنے اموال اور اپنی جانوں کے ساتھ۔ یہی لوگ سچے ہیں۔''

اِسی طرح اللہ کے رسول ﷺ کا ایمان کے حوالے سے ارشاد ہے :

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ ھَوَاہُ تَبَعاً لِّمَا جِئْتُ بِہٖ

''تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک اُس کی خواہشِ نفس اُس ہدایت کے تابع نہ ہو جائے جو میں لایا ہوں'' (بیہقی)

گویا اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کو ایسا ایمان مطلوب ہے کہ جس کے نتیجہ میں نہ صرف انسان کا اپنا عمل شریعت کے مطابق ہو بلکہ وہ اجتماعی زندگی میں بھی شریعت کے نفاذ کے لئے مال اور جان سے جہاد کر رہا ہو۔

- وَالرَّسُوْلُ یَدْعُوْاکُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّکُمْ سے مراد یہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ تمہیں کسی غیر پر ایمان لانے کی دعوت نہیں دے رہے بلکہ ایک ایسی ہستی پر ایمان لانے کی دعوت دے رہے ہیں جو تمہارا رب یعنی محسنِ حقیقی ہے۔ اُسی نے تمہیں پیدا کیا، وہی تمہارا مالک ہے اور وہی تمہارا وہ رازق ہے جو تمہاری تمام ضروریات پوری کر کے تمہیں پال رہا ہے۔ شکر گزاری اور احسان مندی کا تقاضا ہے کہ اپنے رب پر نہ صرف ایمان لایا جائے بلکہ دل و جان سے اُس کے احکامات کی اطاعت کی جائے۔

- وَقَدْ اَخَذَ مِیْثَاقَکُمْ کے الفاظ میں اُس عہد کی طرف اشارہ ہے جو کلمہ پڑھ کر ہر مسلمان اللہ تعالیٰ سے کرتا ہے۔ یہ عہد سورۂ توبہ آیت 111 میں بیان ہوا ہے :

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِینَ اَنفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ
یُقٰتِلُونَ فِیْ سَبِیلِ اللّٰهِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ

''بے شک اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کی جانیں اور مال خرید لئے ہیں جنت کے عوض
وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں، قتل کرتے ہیں (کافروں کو) اور قتل کئے جاتے ہیں۔''

اِس عہد کی رُو سے ہم اپنی جان اور اپنے مال کا اللہ کے ہاتھ سودا کر چکے ہیں اور یہ مال وجان ہمارے پاس اللہ کی امانتیں ہیں۔ ایفائے عہد اور ادائے امانت کا تقاضا ہے کہ اب مال وجان اللہ کی اطاعت اور دین کی سربلندی کے لئے اِس طرح وقف کر دیے جائیں کہ ہم قتال فی سبیل اللہ کی طرف لے جانے والی راہ پر چل کر فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ کی سعادت حاصل کر سکیں۔

☆ آیت : 9 :

هُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبْدِهٖ اٰیٰتٍۢ بَیِّنٰتٍ -- وہی تو ہے جو نازل کرتا ہے اپنے بندے پر واضح آیات -- لِّیُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ -- تاکہ نکال لائے تمہیں اندھیروں سے روشنی میں -- وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ﴿﴾ اور بے شک اللہ تم پر نہایت شفقت کرنے والا مہربان ہے۔

- اِس آیت میں رہنمائی فرما دی گئی کہ دین کا پہلا تقاضا پورا کرنے یعنی ایمانِ حقیقی کے حصول کا ذریعہ ہے قرآنِ حکیم۔ فرمایا اللہ نے اپنے بندے یعنی نبی اکرم ﷺ پر وہ واضح آیات نازل فرمائی ہیں جس سے وہ تمہیں اندھیروں سے ''نور'' کی طرف لا رہے ہیں۔ یہ اندھیرے بے یقینی کے ہیں، شرک کے ہیں، کفر و الحاد کے ہیں، مادیت کے ہیں، حرص وہوا کی غلامی کے ہیں۔ نور سے مراد ہے ایمانِ حقیقی۔ سورۂ نور کی آیت 35 میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ قرآنِ حکیم میں ایمان کو نور کہا گیا ہے جو نورِ فطرت اور نورِ وحی کا مجموعہ ہوتا ہے۔ سورۂ تغابن کی آیت 8 میں قرآنِ حکیم کے لئے

بھی لفظ "نور" آیا ہے :

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِیْٓ اَنْزَلْنَا

''پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اُس کے رسول ؐ پر اور اُس نور پر جو ہم نے نازل فرمایا۔''

قرآن از خود نور ہے اور درحقیقت اِسی سے نورِ ایمان حاصل ہوتا ہے۔ گویا ایمانِ حقیقی کے حصول کا ذریعہ ہے قرآنِ حکیم کی واضح آیات پر غور وفکر۔ آیت کے معنی ہوتے ہیں نشانی۔ اِس کے ذریعہ سے انسان کے قلب میں موجود ایمان تازہ اور شعور کی سطح پر اجاگر ہو جاتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے قرآن کی اِن واضح آیات کی تلاوت کے ذریعہ ہی صحابہ کرام ؓ کے دلوں کو نورِ ایمان سے اِس طرح منور کیا کہ وہ شرک، الحاد اور مادہ پرستی سے تائب ہو گئے۔ توحید اُن میں سرایت کر گئی، اُن کی نگاہ میں دنیا کی حقیقت مچھر کے پر سے بھی کم ہو گئی، فکرِ آخرت اُن پر طاری ہو گئی اور رسالت کو وہ نوعِ انسانی کے لئے ایک عظیم رحمت سمجھنے لگے۔ بقول مولانا ظفر علی خان :

ایمان نہیں وہ جنس جسے لے آئیں دکانِ فلسفہ سے
ڈھونڈھے سے ملے گی عاقل کو یہ قرآں کے سیپاروں میں

سورۂ انفال آیت 2 میں قرآن کی تاثیر بیان کی گئی :

وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْهِمْ اٰیٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِیْمَانًا

''اور جب اُن پر اُس کی آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو یہ اُن کے ایمان
کو بڑھا دیتی ہیں۔''

سورۂ شوریٰ آیت 52 میں بیان کیا گیا کہ خود نبی اکرم ﷺ کے ایمان کی تکمیل بھی قرآنِ حکیم کے ذریعہ ہوئی :

مَا كُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِیْ بِهٖ مَنْ
نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ وَاِنَّكَ لَتَهْدِیْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿﴾

''(اے نبیؐ) آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور نہ ہی جانتے تھے ایمان کو لیکن ہم نے اِس (قرآن) کو نُور بنایا ہے جس کے ذریعہ سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں اور بے شک اب آپؐ سیدھے راستہ کی طرف ہدایت دے رہے ہیں۔''

- اللہ کے دین کی سربلندی کے ضروری ہے کہ ہم ایمانِ حقیقی کے حصول کی کوشش کریں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ :

وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿﴾

''غالب تم ہی ہو گے بشرطیکہ مومن ہو۔''

پھر کسی معاشرے میں تبدیلی کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اُس کے اُن افراد کی سوچ اور فکر کو بدلا جائے جو اپنی صلاحیت کے اعتبار سے دانشور ہوتے ہیں اور معاشرے کے باقی لوگ اُن کے دیے ہوئے نظریات کی پیروی کرتے ہیں۔ یہ معاشرے کی وہ ذہین اقلیت (intelligentisia یا intellectual elite) ہے جسے معاشرے کا brain trust کہا جاتا ہے۔ یہی ذہین اقلیت معاشرے کا رُخ معین کرتی ہے۔ اگر یہ "ذہین اقلیت" دولتِ ایمان سے محروم رہتی ہے اور کچھ دیگر افراد ایمان کی دولت سے بہرور ہو جاتے ہیں تو کچھ جزوی سی اصلاح ہو جائے گی لیکن اُس معاشرہ میں بحیثیت مجموعی کوئی بڑی تبدیلی واقع نہ ہوگی یعنی دین کی سربلندی کی منزل سر نہ ہوگی۔ چنانچہ معاشرے کی بحیثیت مجموعی اصلاح کے لیے ذہین اقلیت کے قلوب میں ایمان کی آبیاری بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ اِس طبقہ میں ایمان کی آبیاری کا ذریعہ صرف اور صرف قرآنِ حکیم ہے۔ قرآنِ حکیم ایک انسان کے احساسات و جذبات کو بھی اپیل کرتا ہے اور اس کے تعقل و تفکر کو بھی۔ قرآنِ حکیم بار بار تعقل و تفکر کی دعوت دیتا ہے اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْن -" کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے ؟" قرآنِ حکیم میں

جہاں ایک عام انسان کے لیے ہدایت ہے وہاں بڑے سے بڑے فلسفی کے ذہن میں پیدا ہونے والے سوالات کا جواب بھی ہے۔ قرآنِ حکیم ہی میں وہ حکمت کے موتی ہیں جو ہر دور کی اعلیٰ علمی سطح پر ذہین عناصر کو متاثر کر سکتے ہیں۔ لہذا دین کی سربلندی کے لئے جس علمی و فکری سطح کا ایمان درکار ہے اُس کا واحد منبع اور سرچشمہ قرآنِ حکیم ہے۔

- اِس آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ کی دو صفات بیان ہوئی ہیں رَءُوْفٌ اور رَحِيْمٌ ۔ سورہ ٔ توبہ کی آخری آیت میں یہ دونوں صفات اِسی ترتیب کے ساتھ نبی اکرم ﷺ کے لئے بھی آئی ہیں۔ اِسی سورہ ٔ حدید کی آیت **27** میں فرمایا گیا کہ یہ دو صفات یعنی رأفت اور رحمت اللہ نے اُن لوگوں کے دلوں میں بھی رکھ دی تھیں جنہوں حضرت عیسیٰؑ کی پیروی کی تھی۔ اِن دونوں صفات کے مابین بڑا گہرا ربط اور تعلق ہے۔ کسی کو تکلیف میں دیکھ کر تڑپ جانا اور اُس کے دکھ کو اپنے اندر محسوس کرنا رأفت ہے۔ پھر اُس کے دکھ کو دور کرنے پر آمادہ اور متوجہ ہو جانا رحمت ہے۔ ایک ہی عمل کے یہ دو رخ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی شانِ رؤوفی اور شانِ رحیمی کا سب سے بڑا مظہر ہے قرآنِ حکیم جو اُس نے اپنے بندے حضرت محمد ﷺ پر نازل فرمایا تاکہ وہ اللہ کے بندوں کو عقائد و اعمال کے حوالہ سے اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لے آئیں۔ اب اللہ کے یہ بندے دنیا میں بھی افراط و تفریط کے دھکوں سے بچیں گے اور آخرت میں بھی دردناک عذاب سے محفوظ ہو جائیں گے۔ واقعی اللہ بندوں کے حق میں رؤوف اور رحیم ہے۔

☆ آیت : **10** :

وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ -- اور تمہیں کیا ہوا ہے کہ خرچ نہیں کرتے اللہ کی راہ میں -- وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ -- حالانکہ آسمانوں اور

زمین کی وراثت اللہ ہی کے لئے ہے -- لَا یَسْتَوِیْ مِنْکُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ -- برابر نہیں تم میں سے وہ جس نے خرچ کیا فتح سے پہلے اور جنگ کی -- اُولٰئِکَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِیْنَ اَنْفَقُوا مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوْا -- ایسے لوگوں کا درجہ اُن لوگوں سے کہیں بڑھ کر ہے جنہوں نے بعد میں خرچ کیا اور جنگ کی -- وَکُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰی -- اور اللہ نے سب سے وعدہ کیا بڑی بھلائی کا -- وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ﴿﴾ اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اُس سے باخبر ہے۔

- اِس آیت کے شروع میں دین کے دوسرے تقاضے انفاق کے حوالے سے جھنجھوڑا گیا کہ تمہیں کیا ہوا ہے کہ خرچ نہیں کرتے اللہ کی راہ میں حالانکہ آسمانوں اور زمین کی وراثت اللہ ہی کے لئے ہے۔ ہر شے کا حقیقی مالک اور وارث اللہ ہے۔ ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے امانت ہے۔ ہمارا امتحان کے ہم اِسے اللہ کی خوشنودی کے لئے لگاتے ہیں یا بچا بچا کر کسی اور کے فائدہ کے لئے رکھ کر خود محروم ہو جاتے ہیں۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے :

تو بچا بچا کے نہ رکھ اِسے تیرا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

مال و اسباب درحقیقت چلتی پھرتی دولت ہے۔ آج کسی کے پاس ہے اور کل کسی کے پاس۔ یہ نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہو رہی ہے۔ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کو جا رہی ہے۔ بالآخر یہ سب کچھ اللہ ہی کے لئے رہ جائے گا۔ کوئی باقی نہ ہوگا جو اِس پر دعویٰ کر سکے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے :

یَقُوْلُ ابْنُ اٰدَمَ مَالِیْ. مَالِیْ وَهَلْ لَّکَ یَا ابْنَ اٰدَمَ مِنْ مَالِکَ اِلَّا مَا اَکَلْتَ فَاَفْنَیْتَ اَوْ لَبِسْتَ فَاَبْلَیْتَ اَوْ تَصَدَّقْتَ فَاَمْضَیْتَ؟

''انسان کہتا ہے میرا مال، میرا مال حالانکہ اے انسان! تیرا مال (ایک تو وہ ہے)

جو تو نے کھا کر ختم کر دیا، یا (دوسرا) پہن کر بوسیدہ کر دیا، یا (تیسرا) صدقہ کر کے (آخرت کے لئے) آگے بھیج دیا۔'' (مسلم)

اِسی طرح ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ آپ ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے سوال کیا :

اَیُّکُمْ مَالُ وَارِثِهٖ اَحَبُّ اِلَیْهِ مِنْ مَالِهٖ؟ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا مِنَّا اَحَدٌ اِلَّا مَالُهٗ اَحَبُّ اِلَیْهِ قَالَ فَاِنَّ مَالَهٗ مَا قَدَّمَ وَمَالَ وَارِثِهٖ مَا اَخَّر

''آپ لوگوں میں سے کون ہوگا جسے اپنے وارث کا مال اپنے مال سے زیادہ عزیز ہو؟'' صحابہ کرامؓ نے عرض کیا اے اللہ کے رسولؐ! ہم میں سے کوئی ایسا نہیں جسے خود اپنا مال (وارث کے مال سے) محبوب تر نہ ہو۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا ''اُس کا مال تو وہ ہے جو اُس نے آگے بھیج دیا اور اس کے وارث کا مال وہ ہے جو اُس نے پیچھے چھوڑا۔'' (بخاری)

اِس حدیث کی رُو سے ہمارا مال صرف وہی ہے جو ہم اللہ کی راہ میں اپنی زندگی کے اندر خرچ کرتے ہیں، باقی مال جو ہم جمع کر رہے ہیں وہ درحقیقت وارثوں کا ہے۔

- مال کے حوالے سے یہ بات پیش نظر رہے کہ ضرورت سے زائد جمع نہ کیا جائے۔ حضرت عیسیٰؑ کے ایک وعظ کا مفہوم ہے :

''اپنا مال زمین پر جمع نہ کرو، جہاں کیڑا بھی خراب کرتا ہے اور چوری کا بھی خوف ہے بلکہ آسمان پر جمع کرو جہاں نہ کیڑا خراب کرتا ہے، نہ چوری کا خوف ہے اور میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جہاں تمہارا مال ہوگا وہیں تمہارا دل ہوگا۔''

اگر ہم نے مال یہیں جمع کیا تو دل بھی یہیں پر لگا رہے گا۔ دنیا سے جانے کو دل نہیں چاہے گا اور موت کے فرشتے دھکے دے دے کر زبردستی لے کر جائیں گے۔ ایک حدیث میں الفاظ آتے ہیں کہ جیسے کانٹے دار جھاڑی پر کپڑا ڈال کر کھینچا جائے اِسی طریقے سے ایسے لوگوں کی روحیں کھینچی جائیں گی۔ اِس کے برعکس جس نے مال

آگے بھیجا ہوگا وہ موت کے لئے ہر وقت تیار ہوگا اور بقول اقبال موت کے وقت اُس کی کیفیت یہ ہوگی کہ :

نشانِ مردِ مؤمن با تو گویم
چوں مرگ آید تبسم برلبِ اوست!

ایک حدیث کی رُو سے اُن کے لیے موت ایسے ہوگی جیسے کہ ایک بند مشکیزے میں سے ایک بوند پانی ٹپک جائے۔ اُن کے لیے یہاں سے نقل مکانی کرنے میں کوئی ناگواری نہیں ہوگی، کوئی سختی نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایسی ہی موت عطا فرمائے۔ آمین!

- آیت کے اگلے حصہ میں فرمایا کہ برابر نہیں ہیں وہ جنہوں نے فتح سے قبل اللہ کی راہ میں خرچ کیا اور جنگ کی۔ مختلف حالات کے اعتبار سے انسان کے عمل کی قدر و قیمت اور اجر و ثواب میں زمین و آسمان کا فرق واقع ہوجاتا ہے۔ حالات نامساعد ہوں، مخالفتیں عروج پر ہوں، دشمن اپنی قوت و وسائل کی بنیاد پر دندنا رہا ہو اور جان و مال کو ہر وقت خطرات لاحق ہوں تو ایسے میں کسی تحریک کے لئے مال و جان کی بازیاں لگانے والوں کے درجات بہت بلند ہیں۔ اِس کے برعکس جب کوئی تحریک ایک ابھرتی ہوئی طاقت کی حیثیت سے سامنے آچکی ہو تو اب تو بہت سے لوگ اُس کے معاون بن جائیں گے۔ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی اسلام مغلوب تھا۔ صحابہؓ نے دین کی اِس غربت کے دور میں قربانیاں دیں اور تھوڑے ہی عرصہ میں اسلام غالب ہوگیا۔ اِس تھوڑے سے عرصہ کی قربانیوں سے اُنہوں نے اپنے لئے عظیم درجات کے حصول کا سامان کرلیا۔ اِس دور میں بھی دینِ اسلام دنیا میں مغلوب ہے اور مخالفین بڑے منظّم انداز سے اِس کے خلاف سازشیں کررہے ہیں، بقول حالی :

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے

اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جذر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

اور

اے خاصہ ٔ خاصانِ رُسل وقتِ دعا ہے
اُمت پہ تیری آکے عجب وقت پڑا ہے
جو دین کہ بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغرباء ہے

دین کی مغلوبیت کے اِس دور میں اگر ہم اِس کی سربلندی کے لئے مال و جان لگاتے ہیں تو ہم بھی بہت عظیم اجر و ثواب کے مستحق ہوسکتے ہیں۔ اِرشادِ نبوی ﷺ ہے :

بَدَاَ الْاِسْلَامُ غَرِیْبًا وَسَیَعُوْدُ کَمَا بَدَاَ غَرِیْبًا. فَطُوْبٰی لِلْغُرَبَآءِ

''اسلام کا آغاز ہوا تھا جبکہ یہ مغلوب تھا اور عنقریب یہ مغلوب ہوجائے گا تو خوشخبری ہے اُس وقت اسلام کا ساتھ دینے والوں کے لئے۔'' (مسلم)

- آیت کے اگلے حصہ میں فرمایا کہ ایسے لوگ جنہوں نے فتح سے قبل اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے انفاق کیا اور جنگ کی، بہت عظیم درجات کے حامل ہوں گے اُن کے مقابلہ میں جنہوں نے بعد میں اللہ کی راہ میں انفاق کیا اور جنگ کی۔ عربی زبان میں عظیم اور اعظم کے الفاظ کسی شے کی معنوی بڑائی اور عظمت کے اظہار کے لئے آتے ہیں جبکہ کبیر اور اکبر کے الفاظ ظاہری بڑائی اور شوکت کے لئے۔ ایسے لوگوں کے درجات اللہ کے ہاں بڑے بھی ہیں اور عظیم بھی جو اُس دور میں جان اور مال کی بازیاں کھیلیں جبکہ دین مغلوب ہو اور اُس کے لئے کام کرنا مشکلات کو دعوت دینے کے مترادف ہو۔

- وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى - ''اوراللہ نے سب سے وعدہ کیا بڑی بھلائی کا'' کے الفاظ کے ذریعہ ایسے لوگوں کو بھی تسلی دی گئی جو فتح کے بعد خلوص سے مال اور جان کی قربانیاں پیش کرتے ہیں۔ دین کیلئے جب بھی کوئی محنت کی جائے گی تو اُس کا اجروثواب ضائع نہیں ہوگا۔ البتہ جنہوں نے اسلام کا ساتھ اُس وقت دیا جب دین پامال تھا اور کوئی دین کا کوئی ساتھی نہیں تھا وہ السَّابِقُوْنَ الا وّلون میں شامل ہیں۔ اللہ کے ہاں اُن کا مرتبہ بہت عظمتوں کا حامل ہے۔ اِس مرتبہ تک وہ لوگ ہرگز نہیں پہنچ سکتے جو اسلام کو غلبہ حاصل ہونے کے بعد آئے اور قتال وانفاق کیا۔ اگر وہ حسن نیت سے آئے ہیں تو اُن کے اجروثواب کی بھی اللہ کی طرف سے ضمانت دی گئی ہے، لیکن درجے میں وہ اُن کے برابر کبھی نہیں ہو سکتے جنہوں نے فتح سے قبل دین کی نصرت کی۔ اب سب سے اللہ کا بہت اچھا وعدہ ہے۔ جنت سب کو ملے گی، جو پہلے آئے ان کو بھی اور جو بعد میں آئے اُن کو بھی، البتہ حسنِ نیت شرط ہے۔ ہاں جنت کے درجات میں بھی بہت فرق وتفاوت ہوگا۔ حدیث میں آیا ہے کہ نچلے درجے والا جنتی اوپر کے درجے والے جنتی کو ایسے دیکھے گا جیسے تم زمین سے آسمان پر ستاروں کو دیکھتے ہو۔
- آیت کے آخر میں فرمایا وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ - ''اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو''۔ اِن الفاظ سے مراد یہ ہے کہ اللہ جانتا کہ کس نے کس نیت کے ساتھ اور کن داخلی وخارجی مشکلات کا مقابلہ کر کے کتنا عمل کیا ہے؟ ہر انسان میں طبعی طور پر کچھ کمزوریاں ہوتی ہیں جو موروثی ہوتی ہیں۔ یہ داخلی رکاوٹیں ہیں۔ پھر ماحول میں بھی کچھ دشواریاں ہوتی ہیں جو بیرونی مشکلات ہیں۔ ایک انسان کو اندرونی وبیرونی طور پر کس طرح کی مشکلات کا سامنا تھا اور اُس نے کس حد تک اِن کا مقابلہ کر کے خلوص کے ساتھ عمل کی کوشش کی، اللہ اِس سے خوب واقف

ہے۔ ایک عمل کی انجام دہی کے لئے کس شخص کو کتنی جدوجہد کرنا پڑی اور کس کے لئے وہ عمل آسان تھا، سب اللہ کے علم میں ہے۔ اِن سب کے اعتبارات سے کسی بھی عمل کی قدر و قیمت کا تعین ہوگا۔ ہمارے بڑے سے بڑے کمپیوٹر کے لیے بھی ممکن نہیں ہے کہ وہ اِن تمام حقائق کو پیش نظر رکھ کر کوئی معاملہ طے کر سکے۔ لہٰذا واضح کر دیا گیا کہ جو کچھ تم کر رہے ہو صرف اللہ اِس سے باخبر ہے۔ تمہارے اعمال کا ہر پہلو اُس کے سامنے واضح ہے۔ ہر شخص کا درجہ اللہ تعالیٰ کے اِسی کامل علم کے اعتبار سے معین ہوگا۔

☆ آیت : **11** :

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا -- کون ہے جو اللہ کو قرضِ دے اچھا قرض؟ -- فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ -- پھر وہ دوچند کرے اُس کے لئے اِس (انفاق) کو -- وَلَهٗ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ﴿﴾ اور اُس کے لئے عزت کا صلہ ہے۔

- انفاق فی سبیل اللہ کے لئے دو مدات ہیں۔ بندوں کی احتیاج پوری کرنے کے لئے جو مال خرچ کیا جاتا ہے اُسے ''صدقہ'' کہا جاتا ہے اور اللہ کے دین کی تبلیغ اور غلبے کے لئے خرچ کیے جانے والے مال کو ''قرضِ حسنہ''۔ دین کی خدمت کے لئے کیے جانے والے انفاق کے نتائج دنیا میں کم ہی نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بندوں کی دلجوئی کے لئے اللہ اِس انفاق کو قرضِ حسنہ قرار دے کر یقین دہانی کرا رہا ہے کہ تمہارا خرچ کیا ہوا مال نہ صرف محفوظ ہے بلکہ اُسے بڑھا چڑھا کر لوٹایا جائے گا اور اِس کے ساتھ ساتھ عزت والا بدلہ بھی دیا جائے گا۔ سورۂ مزمل کے آخر میں یہی مضمون اِس طرح بیان ہوا :

وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا

"اور اللہ کو دیتے رہو اچھا قرض اور جو کچھ تم اپنے لئے آگے بھیجو گے بھلائی میں سے
اُس کو اللہ کے ہاں پاؤ گے بہتر اور اجر کے اعتبار سے عظیم۔"

سورۂ حدید کی اِس آیت میں مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا کے الفاظ میں للکارنے کا انداز ہے کہ کون ہے وہ جس کا اللہ اور آخرت پر یقین اِس درجہ پر پہنچ چکا ہو کہ وہ نتائج کی پرواہ کیے بغیر اپنا مال اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے لگانے کے لئے تیار ہو۔

- نوٹ کیجیے کہ یہاں اجر کے ساتھ " کریم " کی صفت آئی ہے۔ اِس سے پہلے آیت **7** میں اجر کے ساتھ " کبیر " کی صفت آئی تھی۔ یہ اجر کی دو صفات ہیں۔ ایک تو مقدار کے اعتبار سے یہ اجر بہت زیادہ ہوگا، دوسرے یہ کہ جب یہ اجر دیا جائے گا تو اِس میں عزت افزائی کا پہلو بھی ہوگا۔ عام طور پر تو یہ ہوتا ہے کہ " اَلْیَدُ الْعُلْیَا خَیْرٌ مِنَ الْیَدِ السُّفْلٰی " کے مصداق لینے والا محسوس کرتا ہے کہ میری حیثیت کچھ کم ہوئی ہے، گری ہے، لیکن نہیں! اللہ کے طرف سے جب اجر ملے گا تو اِس میں اکرام اور اعزاز ہوگا۔ ویسے تو ہم سب رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ - ''اے اللہ تو جو خیر میری جھولی میں ڈال دے میں اُس کا فقیر ہوں'' (سورۂ قصص آیت **24**) کے مصداق اللہ کے در کے بھکاری ہیں لیکن اللہ ہمیں اجر دیتے ہوئے ہماری عزت افزائی فرمائیے گا۔ یہ اللہ کا اپنے بندوں پر بہت بڑا احسان ہے۔
- صحابہ کرامؓ قرآنِ حکیم کے احکامات عمل کی نیت سے سنتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی اور نبی اکرم ﷺ کی زبانِ مبارک سے لوگوں نے اِس کو سنا تو حضرت ابوالدَّحداح انصاریؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ، کیا اللہ تعالیٰ ہم سے قرض چاہتا ہے؟ آپ ﷺ نے جواب دیا، ہاں، اے ابوالدحداح۔ اُنہوں نے کہا، ذرا اپنا ہاتھ مجھے دکھایئے۔ آپ ﷺ نے اپنا

ہاتھ اُن کی طرف بڑھا دیا۔ اُنہوں نے آپ ﷺ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا ''میں نے اپنے رب کو اپنا باغ قرض دے دیا''۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ اُس باغ میں کھجور کے چھ سو درخت تھے، اُسی میں ان کا گھر تھا، وہیں اُن کے بال بچے رہتے تھے۔ نبی اکرم ﷺ سے یہ بات کر کے وہ سیدھے گھر پہنچے اور بیوی کو پکار کر کہا ''دَحداح کی ماں، نکل آؤ، میں نے یہ باغ اپنے رب کو قرض دے دیا ہے''۔ وہ بولیں ''تم نے نفع کا سودا کیا دَحداح کے باپ'' اور اُسی وقت اپنا سامان اور اپنے بچے لے کر باغ سے نکل گئیں (ابن ابی حاتم)۔ اِس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مخلص اہلِ ایمان کا طرزِ عمل اُس وقت کیا تھا، اور اِسی سے یہ بات بھی سمجھ میں آسکتی ہے کہ وہ کیسا قرض حسن ہے جسے کئی گنا بڑھا کر واپس دینے اور پھر اوپر سے اجرِ کریم عطا کرنے کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے۔ یہ ہے مطلوب کہ مطالبہ آئے اور فوراً پورا کیا جائے، اللہ کی پکار سامنے آئے اور فوراً البیک کہی جائے۔ یہ ہے وہ جذبۂ انفاق کہ جس نے ایک جدوجہد کو کامیابی سے ہمکنار کیا اور محض تیئیس برس کی مختصر سی مدت میں ایک عظیم انقلاب برپا ہوگیا۔ اللہ ہمیں بھی اپنے دین کے لئے ایسی قربانیاں دینے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

منتخب نصاب حصّہ ششم

سورۂ حدید حصّہ سوم : آیات 12 تا 15

دین کے تقاضے اور انجامِ آخرت

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ O بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ O

یَوْمَ تَرَی الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ یَسْعٰی نُوْرُھُمْ بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَبِاَیْمَانِھِمْ بُشْرٰکُمُ الْیَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خَالِدِیْنَ فِیْھَا ذٰلِکَ ھُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ(12) یَوْمَ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِکُمْ قِیْلَ ارْجِعُوْا وَرَاءَکُمْ فَالْتَمِسُوا نُوْرًا فَضُرِبَ بَیْنَھُمْ بِسُوْرٍ لَّہٗ بَابٌ بَاطِنُہٗ فِیْہِ الرَّحْمَۃُ وَظَاھِرُہٗ مِنْ قِبَلِہِ الْعَذَابُ(13) یُنَادُوْنَھُمْ اَلَمْ نَکُنْ مَّعَکُمْ قَالُوْا بَلٰی وَلٰکِنَّکُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَکُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْکُمُ الْاَمَانِیُّ حَتّٰی جَآءَ اَمْرُ اللّٰہِ وَغَرَّکُمْ بِاللّٰہِ الْغَرُوْرُ(14) فَالْیَوْمَ لَا یُؤْخَذُ مِنْکُمْ فِدْیَۃٌ وَّلَا مِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مَاْوٰکُمُ النَّارُ ھِیَ مَوْلٰکُمْ وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ(15)

پچھلی آیات میں دین کے دو تقاضے بیان ہوئے تھے ایمان اور انفاق۔ اِن آیاتِ مبارکہ میں دین کے تقاضے ادا کرنے والوں کا آخرت میں حسین انجام بیان کیا گیا ہے۔ اِس کے بعد تفصیل سے دین کے تقاضوں سے پہلوتہی کرنے والوں کو منافقین قرار دے کر اُن کے برے انجام کا نقشہ کھینچ دیا گیا ہے۔

اِن آیات میں جو اہم ترین موضوع وارد ہوا ہے وہ ہے نفسیاتی سطح پر نفاق کے مرض کے درجہ

بدرجہ شدت اختیار کرنے کی کیفیات کا بیان۔ نفسیاتی طور پر منافق کے اندر کی کیا کیفیت ہوتی ہے؟ اور اس اعتبار سے نفاق کے کیا مدارج اور مراحل ہیں؟ نفاق کہاں سے شروع ہوتا ہے، پھر اس کا دوسرا، تیسرا اور چوتھا مرحلہ کیا ہے؟ حقیقتِ نفاق کے ضمن بیان کیا جا چکا ہے کہ ظاہری اعتبار سے نفاق کے چار درجے (stages) ہوتے ہیں۔ نفاق کا پہلا درجہ یہ ہے کہ جب اللہ کی راہ میں مال اور جان کھپانے کا حکم آتا ہے تو ایسا شخص انفاقِ مال اور جہاد و قتال سے بچنے کے لئے جھوٹے بہانے شروع کر دیتا ہے۔ لیکن جب محض جھوٹے بہانوں کا اعتبار نہیں رہتا تو پھر جھوٹی قسمیں کھائی جاتی ہیں اور یہ نفاق کا دوسرا درجہ ہے۔ نفاق کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ دوسروں کو بھی دین کے لئے مالی و جانی قربانی دینے سے روکنے کی کوشش کرنا۔ اِس کے بعد نفاق کا چوتھا درجہ ہے اُن مخلص اہلِ ایمان کے خلاف شدید نفرت اور بغض جو اللہ کی راہ میں جان اور مال کی بازیاں لگا رہے ہوتے ہیں۔ یہ چار مدارج تو علامات ہیں جو عمل میں ظاہر ہوتی ہیں، لیکن ذہن میں اور نفسیات کے اندر جو کھچڑی پک رہی ہوتی ہے وہ کیا ہے؟ اور یہ علامات درحقیقت کس اندرونی مرض کا ظہور ہیں؟ یہ سورۂ حدید کے اِس حصہ کا مرکزی مضمون ہے۔

☆ آیت : 12 :

یَوْمَ تَرَی الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ -- (اے نبیؐ) اُس روز آپؐ دیکھیں گے اہلِ ایمان مردوں اور عورتوں کو -- یَسْعٰی نُوْرُھُمْ بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَبِاَیْمَانِھِمْ -- دوڑتا ہوگا اُن کا نور اُن کے سامنے اور داہنی طرف -- بُشْرٰکُمُ الْیَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ -- (کہا جائے گا) بشارت ہو تمہیں اُن باغات کی بہتی ہیں جن کے نیچے سے نہریں -- خَالِدِیْنَ فِیْھَا -- ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اُن (باغات) میں -- ذٰلِکَ ھُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ﴿﴾ وہی ہے شاندار کامیابی۔

- اِس آیت میں میدانِ حشر کے ایک خاص مرحلے کا ذکر ہے جسے عرف عام میں پل صراط سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ ایک تاریک راستہ ہے جو جہنم کے اوپر سے گزرتا ہے۔ اِس راستہ

کو طے کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان کے پاس نور یعنی روشنی ہو۔ دین کے تقاضے ادا کرنے والوں کے پاس یہ نور ہوگا اور وہ اِس کی مدد سے یہ کٹھن راستہ عبور کر کے جنت میں چلے جائیں گے۔ دین کے تقاضوں سے پہلوتہی کرنے والے اِس نور سے محروم ہوں گے اور تاریکیوں میں ٹھوکریں کھا کر جہنم میں گر جائیں گے۔

- اِس آیت میں فرمایا کہ مومن مردوں اور مومن خواتین کے سامنے بھی نور ہوگا اور دائیں طرف بھی۔ سامنے کے نور سے مراد ہے ایمانِ حقیقی کا نور۔ سورہ ٔنور کی آیت **35** کی روشنی میں یہ حقیقت سامنے آچکی ہے کہ ایمانِ حقیقی ایک نور ہے جو نورِ فطرت اور نورِ وحی کے امتزاج سے وجود میں آتا ہے اور اِس نور کا محل اور مقام قلب ہے۔ ایمانِ حقیقی کا حصول دین کا پہلا تقاضا ہے۔ چونکہ یہ ایمان دل میں ہوتا ہے لہٰذا اِس کا نور انسان کے سامنے ہوگا۔ دوسرا نور ہے نورِ اعمال۔ نیک انسان کا نامہ ٔاعمال دائیں ہاتھ میں ہوگا لہٰذا یہ نور انسان کے دائیں طرف ہوگا۔ ہر عمل کے اندر یا کوئی نورانیت ہے یا ظلمانیت۔ ہماری بصارتِ ظاہری اِس کا ادراک نہیں کر پاتی۔ جب انسان اچھا یا برا عمل کرتا ہے تو اُس عمل کی نورانیت یا ظلمانیت کو اپنی شخصیت میں جذب کرتا ہے۔ روزِ قیامت اِسی کا ظہور ہوگا کیونکہ اُس روز ہر شے کی اصل حقیقت سامنے آجائے گی۔
- یہ مضمون اِس سے قبل سورہ ٔتحریم کی آیت **8** میں بھی آچکا ہے :

نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

''اُن کا نُور اُن کے سامنے اور داہنی طرف روشنی کرتا ہوا چل رہا ہوگا اور وہ التجا کریں گے اے ہمارے رب! ہمارے لئے پورا فرما دے ہمارے نور کو اور ہمیں معاف فرما بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے''۔

ابنِ جریرؒ نے نبی اکرمؐ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ ''کسی کا نور اتنا تیز ہوگا کہ مدینہ سے عدن

تک کی مسافت کے برابر فاصلے تک پہنچ رہا ہوگا اور کسی کا نور مدینہ سے صنعاء تک اور کسی کا اس سے کم یہاں تک کہ کوئی مومن ایسا بھی ہوگا کہ جس کا نور اُس کے قدموں سے آگے نہ بڑھے گا''۔ اِسی لئے سورہ ٔتحریم کی اِس آیت میں ذکر کیا گیا کہ اہلِ ایمان اللہ سے اپنے نور کے اضافے کے لئے دعا کریں گے اور اُن گناہوں پر بخشش مانگیں گے جن کے اثرات نے اُن کے نور کو دھندلا کر دیا۔ اللہ ہر شے پر قادر ہے اور اُسے اختیار ہے کہ اپنے فضل و کرم سے گناہوں سے درگزر فرما کر نور میں کمی کی تلافی فرما دے۔

- اِس آیت میں مومن مردوں اور مومن خواتین کا ذکر علیحدہ علیحدہ کیا گیا۔ اگلی آیت میں نفاق کے ضمن میں بھی یہی اسلوب ہے۔ گویا یہاں خواتین کے علیحدہ تشخص اور اُن کی ذاتی اخلاقی ذمہ داریوں کو نمایاں کیا گیا ہے۔ روزِ قیامت ہر مرد کو اپنا حساب دینا ہوگا اور ہر خاتون کو اپنا۔ شوہر خواہ کتنا نیک ہو، اپنی بیوی کے کام نہیں آسکتا اور بیوی خواہ کتنی نیک ہو، شوہر کو نہیں بچا سکتی۔ اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ (مرد عورتوں پر حاکم و نگہبان ہیں -- النساء : **34**) کی روشنی میں خواتین دنیا میں بیوی کی حیثیت میں تو شوہر کے تابع ہیں لیکن روزِ قیامت بیوی، شوہر کے تابع نہ ہوگی اور اِس کا حساب بالکل علیحدہ حیثیت میں ہوگا۔
- اِس آیت میں مزید فرمایا کہ جب مومن مرد اور خواتین پل صراط کے کٹھن مرحلے کو طے کر رہے ہوں گے تو اُنہیں خوشخبری دی جائے گی کہ تمہاری محنت اور مشقت کا دور ختم ہوا۔ امتحان اور آزمائش کے مرحلے سے تم گزر آئے ہو۔ اب تمہارے لئے وہ باغات ہیں جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہیں۔ اِن باغات میں تم ہمیشہ ہمیش رہو گے اور یہی ہے سب سے بڑی اور عظیم کامیابی۔ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ میں هُوَ کی ضمیر حصر کا مضمون پیدا کر رہی ہے یعنی اصل کامیابی یہی ہے۔ مقابلہ کرنے والوں کو چاہیئے کہ اِس کامیابی کے حصول کے لئے مقابلہ کریں۔ سورہ ٔمطففین آیت **26** کے مطابق وَفِيْ

ذٰلِکَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ یعنی چاہیئے کہ آگے نکلنے والے اِس معاملہ میں ایک دوسرے سے آگے نکلیں۔ یہ نفسیاتی اعتبار سے بہت اہم مسئلہ ہے۔ جو شخص دین کی کسی خدمت کا بیڑا اٹھائے اُس پر یہ بات پوری طرح واضح ہونی چاہئے کہ اُس کا نصب العین سوائے آخرت کی فلاح اور اللہ کی رضا کے کوئی نہ ہو۔ کوئی اور شے اُس کی نظر میں نصب العین کا درجہ اختیار نہ کرلے۔ وہ دنیوی نتائج کی پرواہ کیے بغیر اپنے دین کے تقاضے ادا کرتا رہے اور اِسی طرزِ عمل سے وہ کامیابی کی اصل منزل کو حاصل کرلے گا۔

☆ آیت : **13** :

یَوْمَ یَقُوْلُ الْمُنَافِقُوْنَ وَالْمُنَافِقَاتُ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا -- اُس روز کہیں گے منافق مرد اور عورتیں ایمان والوں سے -- اُنْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِکُمْ -- ہمارا انتظار کرو تاکہ ہم لے لیں تمہارے نور میں سے کچھ حصہ -- قِیْلَ ارْجِعُوْا وَرَاءَکُمْ فَالْتَمِسُوا نُوْرًا -- کہا جائے گا لوٹ جاؤ اپنے پیچھے (دنیا میں) اور تلاش کرو نور -- فَضُرِبَ بَیْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ -- پھر حائل کردی جائے گی اُن کے درمیان ایک دیوار جس میں ہوگا ایک دروازہ -- بَاطِنُهٗ فِیْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ﴿﴾ اُس (دیوار) کی اندرونی جانب رحمت ہوگی اور اُس کے سامنے باہر کی جانب عذاب ہوگا۔

- اِس آیت میں روزِ قیامت پلِ صراط پر اُن لوگوں کی بے بسی اور انجامِ بد کا بیان ہے جنہوں نے دنیا میں دین کے تقاضوں سے پہلو تہی کی۔ ایسے لوگ منافق قرار پائیں گے، نورِ ایمان و نورِ اعمال سے محروم ہوں گے اور اندھیروں میں ٹھوکریں کھائیں گے۔
- بے بسی کے عالم میں منافق مرد اور منافق خواتین اہلِ ایمان کو پکار کر کہیں گے کہ کہاں آگے بڑھے چلے جارہے ہو، ہمارے پاس کوئی روشنی نہیں ہے، ذرا ٹھہرو، رکو تاکہ ہم بھی

تمہارے نور سے استفادہ کرلیں۔ اہلِ ایمان خود اُس کٹھن مرحلہ کو عبور کرنے کی فکر میں ہوں گے لہٰذا وہ منافقین کو کوئی جواب نہ دیں گے۔ حدیثِ نبوی ﷺ ہے :

حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ اُنہیں ایک دفعہ دوزخ کا خیال آیا، اور وہ رونے لگیں، رسول اللہ ﷺ نے پوچھا، تمہیں کس چیز نے رلایا؟ عرض کیا، مجھے دوزخ یاد آئی، اور اُسی کے خوف نے مجھے رلایا ہے، تو کیا آپ قیامت کے دن اپنے گھر والوں کو یاد رکھیں گے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تین جگہ تو کوئی کسی کو یاد نہیں کرے گا (اور کسی کی خبر نہیں لے گا) ایک وزنِ اعمال کے وقت، جب تک کہ یہ نہ معلوم ہوجائے، کہ اُس کے اعمال کا وزن ہلکا ہے یا بھاری، اور دوسرے اعمالناموں کے ملنے کے وقت جبکہ مردِ مومن اپنے داہنے ہاتھ میں اپنا اعمال نامہ پاکر خوشی خوشی دوسرے سے کہے گا، کہ پڑھو میرا اعمال نامہ، یہاں تک کہ معلوم ہوجائے، کہ کس ہاتھ میں دیا جاتا ہے اس کا اعمال نامہ، آیا داہنے ہاتھ میں، یا پیچھے کی جانب سے بائیں ہاتھ میں، اور تیسرے پلِ صراط پر جبکہ وہ رکھا جائے گا، جہنم کے اوپر (اور حکم دیا جائے گا سب کو اُس پر سے گزرنے کا)۔'' (ابوداؤد)

مومنین تو منافقین کی فریاد کا جواب نہ دیں گے لیکن اللہ کی طرف سے کوئی پکارنے والا منافقین سے کہے گا کہ لوٹ جاؤ اپنے پیچھے کی جانب اور تلاش کرو نور۔ یہاں ترجمانی کرنی پڑے گی کہ اگر ممکن ہے تو دنیا میں واپس جاؤ اور وہاں سے نور حاصل کرکے لاؤ۔ یہ نور دنیا کی زندگی ہی سے حاصل کیا جاسکتا تھا۔ روزِ قیامت کسی کا دوبارہ دنیا میں آنا ناممکن ہوگا لہٰذا یہ الفاظ کہ اگر لوٹ سکتے ہو تو لوٹ جاؤ پیچھے کی جانب، منافقین کی حسرتوں میں اور اضافہ کریں گے۔

- اِس آیت میں مزید فرمایا کہ پھر مومنوں اور منافقوں کے درمیان ایک فصیل حائل کردی جائے گی جس میں ایک دروازہ ہوگا۔ اِس فصیل کے اندر کی جانب رحمتِ خداوندی ہوگی اور بیرونی جانب عذاب۔ گویا یہ فصیل جنت اور دوزخ کے درمیان حائل ہے۔ اِس فصیل

میں دروازہ اُن گناہ گار مسلمانوں کو جہنم سے نکالنے کے لئے ہے جو صدقِ دل سے ایمان تو لائے تھے لیکن اپنے گناہوں کی وجہ سے جہنم کے مستحق قرار پائے۔ یہ مسلمان اپنے گناہوں کی سزا پانے کے بعد اِس دروازہ کے ذریعہ جہنم سے نکال دیے جائیں گے۔ اہلِ سنت کا مجمع علیہ عقیدہ ہے کہ جس شخص کے دل میں ایمان کی کچھ رمق بھی ہوگی وہ اپنے گناہوں کی سزا پا کر بالآخر جہنم سے نکال لیا جائے گا۔ جہنم میں خُلود صرف ان کے لئے ہے جن کے دلوں میں سرے سے ایمان کی کوئی رمق نہیں ہوگی۔ البتہ بعض بے عمل مسلمان کہہ دیتے ہیں چلو کچھ عرصہ جہنم میں سزا پانے کے بعد جنت میں چلے جائیں گے۔ یہ سوچ انتہائی غلط ہے۔ سورۂ فرقان آیت **66** میں فرمایا گیا :

اِنَّهَا سَآءَ تْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا

''بے شک جہنم بری جگہ ہے مستقل رہنے کے اعتبار سے اور
عارضی رہنے کے اعتبار سے بھی''۔

جہنم بہت بری جگہ ے اور وہ عارضی طور پر داخل ہونے والے کو بھی اپنی پوری ہولنا کی دکھا دے گی۔ **اَللّٰهُمَّ اَجِرْ نَا مِنَ النَّارِ** ۔آمین

☆ **آیت : 14 :**

يُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ -- وہ (منافقین) پکاریں گے اُن (اہل ایمان) کو کیا ہم (دنیا میں) تمہارے ساتھ نہ تھے؟ -- **قَالُوا بَلٰى** -- وہ (مسلمان) جواب دیں گے کیوں نہیں! -- **وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ** -- اور لیکن تم نے خود کو (دنیا کی محبت کے) فتنہ میں ڈالا -- **وَتَرَبَّصْتُمْ** -- اور تم (ہمارے احکامات پر عمل کے حوالے سے) تاخیر کرتے رہے -- **وَارْتَبْتُمْ** -- اور تم (جزا و سزا کے حوالے سے) شک میں پڑ گئے -- **وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ** -- اور تمہیں کچھ خوش کن خواہشات نے دھوکہ میں ڈال دیا --

حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ -- یہاں تک کہ اللہ کا حکم (تمہاری موت کا فیصلہ) آ پہنچا -- **وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ** ۞ اور اللہ کے بارے میں تمہیں ایک بڑے دغا باز (شیطان) نے دھوکہ دیا۔

- اِس آیت میں فرمایا کہ منافقین جہنم میں گرنے کے بعد چیخ چیخ کر مومنوں کو پکاریں گے کہ کیا ہم دنیا میں تمہارے ساتھ نہ تھے؟ مومنین اب محفوظ مقام پر پہنچ چکے ہوں گے لہٰذا جواب دیں گے کیوں نہیں! ہمارے تمہارے درمیان والدین اور اولاد کا یا شوہر اور بیوی کا یا بہن بھائی کا یا باہم دوستی کا یا کوئی اور تعلق تھا لیکن تم نے اپنے آپ کو فتنہ میں مبتلا کیا، تم گو مگو کی کیفیت میں انتظار کرتے رہے، تم شکوک و شبہات میں پڑ گئے، تمہیں تمہاری خوش کن خواہشات نے دھوکہ میں ڈالا اور یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ یعنی تمہاری موت کا وقت آ گیا۔ درحقیقت تمہیں ایک بہت بڑے دھوکہ باز یعنی شیطان نے اللہ کے حوالے سے فریب میں مبتلا کیا۔
- اِس آیت میں ایک مومن کے باطنی اعتبار سے درجہ بدرجہ منافق بن جانے کے چار مراحل کا ذکر ہے :

i- اپنے آپ کو فتنے میں مبتلا کرنا۔
ii- دین کے تقاضے ادا کرنے کے حوالے سے گومگو کا شکار ہو جانا۔
iii- ذہن میں شکوک و شبہات کا گھر کر لینا۔
iv- خود ساختہ خوش کن خواہشات کے دھوکہ میں آ کر دین کے تقاضوں سے غفلت برتنا۔

نفاق کا پہلا مرحلہ :

نفاق کا پہلا مرحلہ ہے اپنے آپ کو فتنہ میں ڈالنا۔ سورۂ تغابن آیت **15** میں فتنہ کی وضاحت اس طرح بیان ہوئی :

اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ

''بے شک تمہارے مال اور تمہاری اولاد تو فتنہ یعنی آزمائش کا ذریعہ ہیں''۔

مال اور اولاد کی محبت انسان کے اندر رچی بسی ہوئی ہے۔ انسان اگر اِس محبت سے اتنا مغلوب ہو جائے کہ اُسے شریعت کے احکامات کا پاس ہی نہ رہے اور وہ اپنی دینی ذمہ داریوں سے غافل ہو جائے تو یہ محبت فتنہ ہے۔ مال و اولاد کی یہ محبت فتنہ ہے اگر یہ اللہ، اُس کے رسول ﷺ اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کی محبت سے قوی تر ہو جائے۔ سورۂ توبہ کی آیت نمبر **24** کو ایک بار پھر ذہن میں تازہ کر لیں :

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝

''کہہ دیجئے (اے نبی ﷺ) اگر تمہارے باپ دادا اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے رشتہ دار اور وہ مال جو تم نے محنت سے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس میں خسارے سے تم ڈرتے ہو اور وہ گھر جو تمہیں پسند ہیں، اگر تمہیں زیادہ محبوب ہیں اللہ سے اور اس کے رسول ﷺ سے اور اس کی راہ میں جہاد سے تو انتظار کرو یہاں تک کہ لے آئے اللہ اپنا فیصلہ (یعنی تمہاری موت) اور اللہ ایسے نافرمانوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔''

مال اور اولاد کو *Asset* یعنی سرمایہ نہیں بلکہ *Liabilities* یعنی ایسی امانتیں سمجھنا چاہیئے جن کے بارے میں روزِ قیامت باز پرس ہوگی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا ۝ (کہف : **46**)

''مال اور بیٹے تو دنیا کی زندگی کی (رونق و) زینت ہیں اور باقی رہنے والی نیکیاں ہیں جو بہتر ہیں تمہارے رب کے نزدیک ثواب کے لحاظ سے اور امید لگانے کے اعتبار سے۔''

گویا نفاق کا پہلا مرحلہ ہے مال و اولاد کی محبت میں اِس قدر کھو جانا کہ اللہ کے احکامات اور آخرت کی تیاری کی فکر ہی نہ رہے۔

نفاق کا دوسرا مرحلہ :

دین کے تقاضوں کی ادائیگی کے حوالے سے گومگو کا شکار ہونا۔ اپنے آپ کو مال اور اولاد کے فتنہ میں ڈالنے کا نتیجہ نکلتا ہے تربص یعنی گومگو کی صورت۔ ایک ہے وہ کیفیت کہ جب دین کے تقاضے واضح ہو گئے تو اب یکسوئی کے ساتھ منجدھار میں کود پڑنا۔ ہر چہ باداباد ما کشتی در آب انداختیم – اب جو ہو سو ہو ہم نے تو اپنی کشتی پانی میں ڈال دی ہے۔ بقول فیضؔ :

واپس نہیں پھیرا کوئی فرمان جنوں کا
تنہا نہیں لوٹی کبھی آواز جرس کی
خیریتِ جاں ، راحتِ تن ، صحتِ داماں
سب بھول گئیں مصلحتیں اہلِ ہوس کی!

ایک ہے گومگو یعنی انتظار کی کیفیت اور فیصلہ نہ کر سکنا کہ چلوں یا نہ چلوں۔ انسان سوچ میں پڑ جائے کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے اور کہیں ویسا نہ ہو جائے! فیصلہ کن اقدام کی صلاحیت انسان میں باقی نہ رہے۔ وہ ایک قدم آگے بڑھائے اور ایک پیچھے ہٹا لے۔ آگے بڑھنے کو بھی جی چاہے لیکن پھر خطرات، آزمائشوں اور قربانیوں کے تقاضے کو دیکھ کر انسان کی ہمت جواب دے جائے اور اُس کا جذبۂ عمل سرد پڑ جائے۔ بقول غالب :

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر

کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے!

یہ شیطان کے حربوں میں سے ہے کہ اگر انسان کسی دینی تقاضے کی ادائیگی کے لئے تیار ہو جائے تو وہ انسان کو تاخیر کی پٹی پڑھاتا ہے تاکہ شاید وقت گزرنے کے ساتھ انسان کا جذبۂ عمل ٹھنڈا ہو جائے۔

نفاق کا تیسرا مرحلہ :

انسان کا ذہن شکوک وشبہات میں مبتلا ہو جائے۔ تربص کا نتیجہ ہے شکوک وشبہات میں پڑ جانا۔ انسان کے پاس جو کوئی تھوڑی بہت پونجی ایمان اور یقین کی ہوتی ہے وہ گومگو کی کیفیت کی وجہ سے زائل ہو جاتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان کا ظاہر و خارج ایک دوسرے سے متاثر ہوتا ہے۔ اگر اس کا باطن اس کے خارج پر عکس ڈالتا ہے تو اس کے خارج سے اس کا باطن بھی متاثر ہوتا ہے۔ اگر انسان کے دل میں یقین کی دولت ہے اور وہ ہمت کر کے آگے بڑھتا ہے تو اِس کے عمل کے ذریعہ اُس کے ایمان ویقین میں اضافہ ہوتا ہے۔ اِس کے برعکس اگر انسان کم ہمتی کی وجہ سے تربص یعنی گومگو کا شکار ہے تو جو تھوڑی بہت پونجی ایمان ویقین کی تھی وہ بھی ہاتھ سے جاتی رہے گی۔ سورۂ منافقون کی آیت **3** میں اِس صورتِ حال کا نقشہ یوں کھینچا گیا :

ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ فَھُمْ لَا یَفْقَھُوْنَ ۞

''یہ اِس لئے کہ وہ ایمان لائے پھر کافر ہو گئے تو اُن کے دلوں پر مہر لگا دی گئی سو اب یہ سمجھتے ہی نہیں''۔

جب دل پر مہر لگ جائے تو انسان دین اور دینی تقاضوں کے صحیح تصور کا فہم حاصل کرنے سے محروم ہو جاتا ہے۔ وہ شکوک وشبہات کے تحت سوچتا ہے کہ ہم اپنا سب کچھ یہاں

کھپا دیں اور معلوم نہیں کہ اس کا کچھ بدلہ بھی ملے گا یا نہیں! پتہ نہیں آخرت ہوگی بھی یا نہیں۔ اِس لئے کہ یہ سارا ادھار کا سودا ہے۔ سورۂ توبہ آیت **111** میں فرمایا گیا:

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ

''اہلِ ایمان سے اللہ نے اُن کے مال اور جانیں خرید لیے ہیں جنگ کے عوض''۔

جنت تو ملے گی آخرت میں، یہاں تو نہیں ملے گی۔ یہ تو ادھار کا سودا ہے اور ادھار کے سودے پر آدمی کچھ نہ کچھ تو متردّد ہوتا ہے۔ اگر نقد سودا ہو تو ٹھیک ہے کہ ہاتھ سے ایک چیز دی اور دوسری لے لی لیکن یہ تو ادھار کا سودا ہے۔ یہ ہے نفاق کا تیسرا مرحلہ جس کی وجہ سے ایمان کی پونجی برف کی طرح پگھلنا شروع ہو جاتی ہے۔

نفاق کا چوتھا مرحلہ :

خود ساختہ خوش کن خواہشات کے فریب میں آ کر دینی تقاضوں کی ادائیگی سے غافل ہو جانا۔ وہ انسان جو آخرت کو مانتا ہو لیکن جرأتِ عمل سے محروم ہو وہ خود کو آخرت میں کامیابی کے اعتبار سے مطمئن کرنے کے لئے کچھ من پسند خواہشات وضع کرتا ہے۔ یہ خواہشات انسان کے ذہن پر اِس درجہ حاوی ہو جاتی ہیں کہ وہ اب اِنہی کے حوالے سے سوچتا ہے اور رفتہ رفتہ ان خواہشات کا تانا بانا ایک نظریہ اور عقیدہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اِن خود ساختہ اور خوش کن خواہشات کو قرآن ''امانی'' کہتا ہے۔ انگریزی میں اِن کے لئے ***wishfull thinkings*** کے الفاظ آتے ہیں۔

کوئی بھی امت مسلمہ جب بگڑتی ہے اور اپنے مقام سے گرتی ہے تو لازماً کچھ ''امانی'' کا سہارا لیتی ہے۔ اہلِ کتاب آخرت کو اور آخرت میں حساب کتاب ہونے کو برحق سمجھتے تھے۔ البتہ جب وہ اپنے عمل کو دیکھتے تھے تو احساس ہوتا تھا کہ عدل کے تقاضے کے اعتبار سے آخرت میں اُن کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ اب اِس مسئلے کا حل اُنہوں نے یہ نکالا کہ کچھ دلفریب خواہشات کو عقیدہ کا درجہ دے دیا۔ اِن خواہشات میں شفاعتِ باطلہ کا عقیدہ،

اللہ کی محبوب قوم ہونے کا عقیدہ (نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ -المائدۃ :18)، جنت کو صرف اپنے ہی لئے مخصوص سمجھنے کا دعویٰ (لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى - البقرۃ :111) اور اپنے بخشے بخشائے ہونے کا خیال (لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً - البقرۃ :80) شامل ہیں۔ ان من گھڑت خواہشات کے نتیجہ میں اہلِ کتاب کا عقیدہ یہ بن گیا تھا کہ اوّل تو ہمارے جہنم میں داخل ہونے کا امکان ہی نہیں ہے، ہم اللہ کے بڑے چہیتے اور لاڈلے ہیں، ہم ابراہیمؑ کی اولاد ہیں، کئی نبی ہم میں سے آئے اور کئی کتابیں ہماری طرف نازل کی گئیں۔ اگر بالفرضِ محال لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے ہمیں جہنم میں ڈالا بھی گیا تو یہ بھی صرف چند دن کے لئے ہوگا اور جلد وہاں سے نکال لیا جائے گا۔ قرآنِ حکیم نے متعدد بار اِن من گھڑت خواہشات کی بڑی شدت سے نفی کی :

وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ
قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۞ (البقرۃ :111)

''اور (یہودی اور عیسائی) کہتے ہیں کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے سوا کوئی جنت میں نہیں جائے گا۔ یہ ان لوگوں کی خواہشات ہیں۔ (اے نبیؐ) کہہ دیجئے کہ اگر سچے ہو تو دلیل پیش کرو''۔

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ
يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۞ (البقرۃ : 80)

''اور وہ کہتے ہیں کہ (دوزخ کی) آگ ہمیں ہرگز نہ چھوئے گی مگر گنتی کے چند روز۔ (اے نبیؐ) اُن سے پوچھیے کہ کیا تم نے اللہ تعالیٰ سے کوئی عہد لے رکھا ہے کہ اللہ جس کے خلاف نہ کرے گا یا تم اللہ کے بارے میں ایسی باتیں کہتے ہو جن کا تمہیں علم ہی نہیں''۔

قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ص وَغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا

يَفْتَرُوْنَ ۞ (آلِ عمران : 24)

''وہ کہتے ہیں کہ (دوزخ کی) آگ ہمیں نہیں چھوئے گی مگر گنتی کے چند روز اور اُنہیں دھوکہ میں ڈال دیا اُن کے دین کے بارے میں اُس جھوٹ نے جو وہ گھڑ رہے ہیں''۔

قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ

''(اے نبیؐ) اُن سے پوچھیے اللہ تمہیں تمہارے گناہوں کی وجہ سے عذاب کیوں دیتا ہے'' (المائدہ :18)

آج یہ گمراہی ہمارے اندر بھی موجود ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے :

لَيَاْتِيَنَّ عَلٰى اُمَّتِيْ مَا اَتٰى عَلٰى بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ

''میری اُمت پر بھی لازماً وہی حالات آکر رہیں گے جو بنی اسرائیل پر آئے تھے اُسی طرح جیسے ایک جوتی دوسری جوتی کے مشابہ ہوتی ہے''۔ (ترمذی)

بنو اسرائیل کی طرح ہم بھی اپنی بے عملی چھوڑنے کے لئے تیار نہیں لیکن اِس کے وبال سے بچنے کے لئے کچھ پر امید لیکن بے سند خواہشات کا سہارا لے کر خود کو جھوٹی تسلی دیتے رہتے ہیں۔ ہم نبی اکرم ﷺ کے دامن سے وابستہ ہیں، ہم بہرحال امت مرحومہ میں شامل ہیں، جہنم تو صرف کفار کے لئے بنائی گئی ہے :

خوار ہیں بدکار ہیں ڈوبے ہوئے ذلت میں ہیں
کچھ بھی ہیں مولا تیرے محبوب کی امت میں ہیں

اللہ تعالیٰ نے سورۂ نساء آیات 123 - 124 میں واضح فرما دیا کہ :

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ؕ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۞ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى
وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ۞

''نہ تمہاری خواہشات سے کچھ ہوگا اور نہ ہی اہلِ کتاب کی خواہشات سے۔ جس نے

برائی کی وہ اُس کی سزا پائے گا اور اپنے لئے اللہ کے سوا کوئی دوست یا مددگار نہ پائے گا۔ اور جس نے اچھا عمل کیا خواہ مرد ہوں یا عورت بشرطیکہ مومن ہوں تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور اُن کے ساتھ تل برابر بھی ناانصافی نہیں کی جائے گی۔''

یہ ہے نفاق کا چوتھا مرحلہ کہ جس کی وضاحت اِن الفاظ میں آئی کہ وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ ۔تمہیں دھوکہ دیئے رکھا تمہاری کچھ من گھڑت خواہشات نے۔

- آیت کے اگلے حصہ میں فرمایا گیا حَتّٰى جَاءَ اَمْرُ اللّٰهِ - یہاں تک کہ اللہ کا حکم آ پہنچا۔ یہاں اللہ کے حکم سے مراد ہے انسان کی موت کا فیصلہ۔ اگر موت سے پہلے پہلے انسان کو اپنی غفلت کا احساس ہو جائے اور وہ سچی توبہ کر کے تو اللہ تمام خطاؤں کو معاف فرما دیتا ہے۔ منافقین روزِ قیامت انجامِ بد سے اس لئے دوچار ہوں گے کہ اُنہوں نے موت کا حکم آنے سے پہلے توبہ نہیں کی۔
- آیت کے آخر میں فرمایا گیا وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ - اور اللہ کے بارے میں تمہیں ایک بڑے دغاباز نے دھوکہ دیا۔ ''غُرُوْر'' کے معنی ہوتے ہیں دھوکہ یا فریب اور ''غَرُوْر'' کا مفہوم ہے بہت ہی دھوکہ دینے والا یعنی بڑا دھوکے باز۔ اِس سے مراد ہے شیطان۔ یہاں زیادہ قابلِ توجہ نکتہ یہ ہے کہ تمہیں اللہ کے بارے میں دھوکہ دیا شیطان نے۔ اللہ کے بارے میں دھوکہ دینا یہ ہے کہ شیطان اللہ کی صرف شانِ رحمت کو انسان کے سامنے کر دیتا ہے جس کے سہارے انسان گناہ پر گناہ کرتا رہتا ہے :

سو سو گناہ کیے تیری رحمت کے زور پر

انسان بے عملی کے باوجود اِس تصور پر خود کو تسلی دیتا رہتا ہے کہ اللہ بڑا رحیم ہے، بڑا کریم ہے، بڑا ودود ہے، نکتہ نواز ہے اور بخشنے کے لئے ہر وقت تیار ہے۔ اللہ انسان سے اُس کی ماں سے بڑھ کر محبت کرتا ہے۔ کیا ماں پسند کرے گی کہ اُس کا بچہ آگ میں جلے؟ اِسی طرح اللہ بھی اپنے بندوں کو آگ میں جلنے نہیں دے گا۔ اُسے اپنی تخلیق سے پیار ہے، وہ

کیسے اِسے آگ میں جھونک دے گا۔ قرآن میں جہنم کا ذکر صرف ڈروے کے لئے ہے تاکہ انسان بالکل ہی بے قابو نہ ہو جائے، بقول شاعر :

عصیاں سے کبھی ہم نے کنارہ نہ کیا　　پر تُو نے دل آزردہ ہمارا نہ کیا
ہم نے تو جہنم کی بہت کی تدبیر　　پر تری رحمت نے گوارا نہ کیا

اللہ کے بارے میں متوازن عقیدہ یہ ہے کہ وہ رحیم بھی ہے لیکن عادل بھی، غفور بھی ہے لیکن سریع الحساب بھی، ودود بھی ہے لیکن عزیزٌ ذو انتقام بھی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۞ وَ اَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ۞

''(اے نبیؐ!) میرے بندوں کو بتا دیجئے کہ میں بڑا بخشنے والا (اور) مہربان ہوں اور یہ کہ میرا عذاب بھی دردناک عذاب ہے''۔ (الحجر: 49 - 50)

اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَاَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۞ (المائدۃ: 98)

''جان رکھو کہ اللہ سخت عذاب دینے والا ہے اور یہ کہ اللہ بخشنے والا مہربان بھی ہے''۔

شیطان اللہ کی صرف شانِ رحمت کو انسان کے سامنے اِس طرح مزین کرتا ہے کہ انسان اللہ کی شانِ قہاری سے غافل ہو کر مسلسل بے عملی کا مرتکب ہوتا رہتا ہے۔ یہ ہے شیطان کا فریب اللہ کے حوالے سے۔ اللہ نے ہمیں خبردار فرمایا :

فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۪ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۞

''پس دنیا کی زندگی تم کو دھوکے میں نہ ڈال دے اور نہ بہت زیادہ دھوکہ دینے والا (شیطان) تمہیں اللہ کے بارے میں کسی طرح کا دھوکہ دے۔'' (لقمان: 33، فاطر: 5)

اللہ کی صرف شانِ رحمت ہی کو بیان کر کے انسان اللہ کی تحسین نہیں بلکہ جزا و سزا کے تصور کی نفی کر رہا ہوتا ہے۔ گویا اُس کا خیال یہ ہے کہ نیکی کرنے والے اور برائی کرنے والے

سب ہی اللہ کی رحمت سے بخشے جائیں گے۔ اللہ نے قرآنِ حکیم میں کئی مقامات پر اس گمراہی کی نفی کی ہے :

اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ۞ مَا لَكُمْ ۫ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۞

''کیا ہم فرمانبرداروں کو برابر کردیں گے نافرمانوں کے؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے کیسے فیصلے کرتے ہو؟'' (القلم : 35-36)

اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِى الْاَرْضِ ۚ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ ۞ (ص:28)

''کیا ہم اُن کو جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے برابر کردیں گے اُن کے جو زمین میں فساد کرتے ہیں یا متقین کو برابر کردیں گے بدکاروں کے؟''

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ۭ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۞

''جو لوگ بُرے کام کرتے ہیں کیا وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم اُن کو اُن لوگوں جیسا کردیں گے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور اُن کی زندگی اور موت یکساں ہوگے؟ برا ہے وہ فیصلہ جو وہ کرتے ہیں۔'' (الجاثیہ :21)

يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۞ الَّذِىْ خَلَقَكَ فَسَوّٰكَ فَعَدَلَكَ ۞ فِىْٓ اَىِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ۞ كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ ۞ وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۞ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۞ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ۞ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِىْ نَعِيْمٍ ۞ وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِىْ جَحِيْمٍ ۞

(الانفطار : 6 - 14)

''اے انسان تجھے اپنے شفیق پروردگار کے بارے میں کس چیز نے دھوکا دیا؟ (وہی تو

ہے) جس نے تجھے بنایا اور (تیرے اعضاء کو) ٹھیک کیا اور (تیرے وجود کو) معتدل رکھا۔ جس صورت میں چاہا تجھے جوڑ دیا۔ مگر تم لوگ جزا وسزا کو جھٹلاتے ہو، حالانکہ بلاشبہ تم پر نگہبان مقرر ہیں۔ عالی قدر لکھنے والے (تمہارے اعمال کے)۔ جو کچھ تم کرتے ہو وہ اسے جانتے ہیں۔ بیشک نیکوکار نعمتوں میں ہوں گے اور بدکردار دوزخ میں۔''

☆ آیت : 15 :

فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ -- پس (اے منافقو!) آج تم سے کوئی فدیہ قبول نہ کیا جائے گا -- وَّلَا مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا -- اور نہ ہی اُن سے جنہوں نے کفر کیا -- مَاْوٰكُمُ النَّارُ -- تمہارا ٹھکانہ آگ ہے -- هِىَ مَوْلٰكُمْ -- وہی تمہاری ساتھی ہے -- وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۞ اور وہ لوٹنے کی بہت بری جگہ ہے۔

- اِس آیت میں خبردار کردیا گیا کہ دنیا میں منافقین مسلمانوں کے ساتھ ہیں لیکن آخرت میں اُن کا انجام کافروں کے ساتھ ہوگا۔ سورۂ نساء میں یہ مضمون اِس طرح بیان ہوا :

اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِىْ جَهَنَّمَ جَمِيْعًا ۞ (النساء : 140)

''بے شک اللہ منافقوں اور کافروں کو دوزخ میں اکٹھا کرنے والا ہے۔''

دنیا میں مجرم جرمانہ دے کر آزاد ہو جاتے ہیں لیکن روزِ قیامت منافقین اور کفار سے کوئی فدیہ قبول نہ کیا جائے گا۔

- آیت کے اگلے حصہ میں فرمایا کہ اے کافرو اور منافقو! آج تمہارا ماویٰ یعنی ٹھکانہ آگ ہے۔ ماویٰ کہتے ہیں ایسی پناہ گاہ کو جس کی طرف انسان خطرات سے بچنے کے لئے لپکتا ہے۔ طنزیہ اسلوب میں کہا گیا کہ اب تمہاری پناہ گاہ آگ ہے۔ مزید طنز کرتے ہوئے حسرت میں اضافہ کیا گیا کہ یہ آگ ہی تمہارا مولا ہے۔ مولا کہتے ہیں ایسے قابلِ اعتماد ساتھی کو جس سے انسان اپنا دکھ درد بانٹ سکے۔ فرمایا تمہاری ہمدرد، غم گسار، دمساز اور

رفیق اب آگ ہے۔ جوشکوہ وفریاد کرنی ہے اِسی سے کرو۔ یہ آگ ہی تمہارا اوڑھنا اور بچھونا ہے اور یہ بہت ہی بری جگہ ہے۔

منتخب نصاب حصّہ ششم

سورۂ حدید حصّہ چہارم : آیات 16 تا 19

قربِ الٰہی کے حصول کا راستہ

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ O بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ O

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا یَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَیْھِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُھُمْ وَکَثِیْرٌ مِّنْھُمْ فٰسِقُوْنَ(16) اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا قَدْ بَیَّنَّا لَکُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ(17) اِنَّ الْمُصَّدِّقِیْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعَفُ لَھُمْ وَلَھُمْ اَجْرٌ کَرِیْمٌ(18) وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖٓ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصِّدِّیْقُوْنَ وَالشُّھَدَآءُ عِنْدَ رَبِّھِمْ لَھُمْ اَجْرُھُمْ وَنُوْرُھُمْ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَکَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ الْجَحِیْمِ(19)

سورۂ حدید کے تیسرے حصہ میں دین کے تقاضوں سے پہلوتہی کا نتیجہ نفاق بیان ہوا اور نفاق کے برے انجام کا ذکر لرزا دینے والے اسلوب میں ہوا۔ اب سورۂ حدید کے اِس چوتھے حصہ میں بڑے جھنجھوڑ دینے والے انداز میں اپنے باطن میں جھانکنے کی دعوت دی گئی ہے۔ آخرت کے ہلا دینے والے حقائق سامنے آنے کے باوجود بھی اگر انسان دینی تقاضوں کی ادائیگی کی طرف مائل نہیں ہو رہا تو وہ اپنے باطن کا جائزہ لے کہ کہیں دل کی سختی اُس انتہا تک تو نہیں پہنچ گئی کہ وہ رفتہ رفتہ انسان کو فاسق بنا دے۔ اِس کے بعد ہمت بندھانے کے انداز میں فرمایا

گیا اگر دل کی دنیا اجڑی ہوئی ہے تب بھی مایوس نہ ہو، اصلاحِ حال کا امکان ہے۔ پھر اصلاحِ حال کے لئے عملی رہنمائی بیان کی گئی ہے۔

☆ آیت : **16** :

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا -- کیا اب بھی وقت نہیں آیا مومنوں کے لئے -- اَن تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ -- کہ گڑگڑائیں اُن کے دل اللہ کی یاد سے -- وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ -- اور اُس سے جو نازل ہوا ہے حق میں سے -- وَلَا یَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلُ -- اور وہ نہ ہو جائیں اُن کی طرح جن کو کتابیں دی گئی تھیں اِس سے پہلے -- فَطَالَ عَلَیْھِمُ الْاَمَدُ -- پھر اُن پر زمانہ طویل گزر گیا (غفلت میں) -- فَقَسَتْ قُلُوْبُھُمْ -- تو سخت ہو گئے اُن کے دل -- وَکَثِیْرٌ مِّنْھُمْ فٰسِقُوْنَ ۞ اور اُن میں سے اکثر نافرمان ہیں۔

- اِس آیت میں اہلِ ایمان کے لئے جھنجھوڑنے کے انداز میں ایک نفسیاتی اپیل ہے۔ اُن سے فرمایا گیا کہ تمہارے سامنے دین کے تقاضے بھی آ گئے، تقاضے ادا کرنے والوں کا حسین انجام بھی آ گیا اور تقاضوں کی ادائیگی سے گریز کرنے والوں کے برے انجام کا نقشہ بھی آ گیا۔ کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ تمہارے دلوں میں رقت پیدا ہو اور وہ اللہ کی یاد اور اُس کی فرمانبرداری کی طرف مائل ہو جائیں۔ سوچو کس وقت کا انتظار کر رہے ہو؟ کس دلیل کے منتظر ہو؟ تمہارے دل کیوں نہیں جھک رہے اللہ کے احکامات کی بجا آوری کے لئے؟ تم ایمان وانفاق کے تقاضے پورے کرنے پر کیوں آمادہ نہیں ہو رہے؟
- شیطان کے حربوں میں سے ایک حربہ یہ بھی ہے کہ وہ انسان سے نیکی کے معاملہ میں تاخیر کراتا ہے۔ انسان پر دین کے مطالبات واضح ہو جاتے ہیں لیکن شیطان کچھ دنیوی معاملات کی انجام دہی تک دین کے تقاضوں کی ادائیگی کو مؤخر کرنے کی پٹی پڑھاتا

ہے۔ابھی اولاد کی تعلیمی ذمہ داریوں سے فارغ ہو جاؤ، ابھی ذرا بچیوں کے ہاتھ پیلے ہو جائیں، ابھی ذرا مکان کی تعمیر مکمل ہو جائے، اِس کے بعد خود کو دین کی خدمت کے لئے وقف کر دینا۔ اِسی لیت ولعل میں وقت گزرتا رہتا ہے، دنیا کے معاملات ختم نہیں ہوتے :

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ، ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان، لیکن پھر بھی کم نکلے

اپنی خواہشات کی تکمیل کے انتظار میں انسان دینی تقاضوں سے مسلسل گریز کرتے کرتے نفاق کی منزلیں طے کر رہا ہوتا ہے۔ قرآن کی روشنی میں دینی ذمہ داریوں کا شعور حاصل ہونے کے باوجود پوری پوری زندگیاں تاخیر و تاویل کی وجہ سے غفلت میں بیت جاتی ہیں اور انسان کی مہلتِ عمر ختم ہو جاتی ہے۔ اِس محرومی سے بچانے کے لئے للکارا گیا کہ اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ کیا وقت آ نہیں گیا کہ اہلِ ایمان کے دل جھک جائیں اللہ کی یاد اور اُس حق کے لئے جو نازل ہو چکا ہے؟ آخر کس بات کا انتظار کر رہے ہو؟ کیا یقین ہے کہ ابھی زندگی باقی ہے؟ کیا کہیں سے تمہارے پاس کوئی ضمانت ہے کہ ابھی تمہارے پاس کچھ مہلتِ عمل موجود ہے؟

- یہ بات اِس سے قبل بیان کی جا چکی ہے کہ مکی - مدنی سورتوں کے چھٹے گروپ کی مدنی سورتوں میں اہلِ کتاب کا ذکر آیا ہے بطورِ عبرت۔ اہلِ کتاب مسلمانوں سے قبل امت کے منصب پر فائز تھے لیکن اُن میں بعض ایسی اعتقادی اور عملی گمراہیاں آ گئیں جن کی وجہ سے اللہ اُن سے ناراض ہو گیا۔ قرآنِ حکیم میں یہ حقیقت کئی بار بیان کی گئی کہ اہلِ کتاب دینِ حق اور اِس کے تقاضوں کا علم رکھتے تھے لیکن اُنہوں نے جان بوجھ کر اختلاف کیا :

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ ۗ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَھُمُ الْعِلْمُ بَغْیًۢا بَیْنَھُمْ (آلِ عمران :19)

''اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے اور اہلِ کتاب نے (اِس دین سے) اختلاف

نہیں کیا مگر علم حاصل ہونے کے بعد آپس کی ضد کی وجہ سے۔''

اہلِ کتاب کے اِس اعراض کو جب ایک طویل مدت بیت گئی تو اُن کے دل سخت ہو گئے۔ جیسا کہ ارشادِ نبوی ﷺ ہے :

''بندہ جب گناہ کرتا ہے تو اُس کے دل پر ایک سیاہ نکتہ پڑ جاتا ہے، اگر وہ توبہ کر لیتا ہے تو وہ سیاہی دور کر دی جاتی ہے اور اگر توبہ کے بجائے گناہ پر گناہ کیے جاتا ہے تو وہ سیاہی بڑھتی جاتی ہے یہاں تک کہ اُس کے پورے دل پر چھا جاتی ہے، یہی رَین (زنگ) ہے جس کا ذکر قرآنِ حکیم (کَلَّا بَلْ ۜ سکتۃ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ مَّا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ ﴿﴾ المطففین :14) میں ہے۔'' (ترمذی)

چونکہ ایمانِ حقیقی کا محل قلب ہے۔ یہ دل کی سختی درحقیقت ایمان کے نور سے محروم ہو جانے کی کیفیت کا بیان ہے۔ سورۂ بقرۃ آیت 74 میں اہلِ کتاب کے دلوں کی سختی کا نقشہ اِس طرح کھینچا گیا :

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُکُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِکَ فَھِیَ کَالْحِجَارَۃِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَۃً ۭ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَۃِ لَمَا یَتَفَجَّرُ مِنْہُ الْاَنْھٰرُ ۭ وَاِنَّ مِنْھَا لَمَا یَشَّقَّقُ فَیَخْرُجُ مِنْہُ الْمَاۗءُ ۭ وَاِنَّ مِنْھَا لَمَا یَھْبِطُ مِنْ خَشْیَۃِ اللّٰہِ ۭ وَمَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿﴾

''پھر اِس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے گویا وہ پتھر ہیں یا ان سے بھی زیادہ سخت اور پتھر تو بعضے ایسے ہوتے ہیں کہ اُن میں سے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ پھٹ جاتے ہیں اور اُن میں سے پانی بہنے لگتا ہے اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے گر پڑتے ہیں اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔''

اِسی قساوتِ قلبی کا منظر آج اُمت مسلمہ پیش کر رہی ہے۔ قرآنِ حکیم اور نبی اکرم ﷺ کی انقلابی جدوجہد کے ذریعہ ہم پر بھی دین کا جامع تصور اور دینی تقاضے واضح ہو چکے ہیں لیکن پھر بھی ہم عمل کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ یہ درحقیقت نتیجہ ہے اُس قساوتِ قلبی

یعنی دل کی سختی کا جس کا ذکر اِس آیت میں کیا گیا۔ یہ قساوتِ قلبی انتہائی مہلک ہے کیونکہ اِسی کی وجہ سے انسان آخر کار فاسق بن جاتا ہے جیسا کہ اِس آیت میں اہل کتاب کے بارے میں آگاہ کیا گیا کہ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ - اوراُن میں سے اکثر فاسق ہیں۔سورۂ توبہ آیت **24** میں فاسق ایسے لوگوں کو کہا گیا جو مرغوباتِ دنیا کی محبتوں کو دینی محبتوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ فاسق اللہ کے باغی کو کہتے ہیں کیونکہ فسق سے مراد ہے اللہ کے حکم کو توڑنا۔ یہ ایک شیطانی عمل ہے۔فسق کا لفظ سورۂ کھف آیت **50** میں ابلیس کی اُس نافرمانی کے لئے استعمال ہوا ہے، جب اُس نے آدمؑ کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا :

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ

"اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔وہ جنات میں سے تھا، پس اُس نے توڑ دیا اپنے رب کا حکم۔"

قرآنِ حکیم میں بار بار فرمایا گیا وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ – اللہ فاسق لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

- اِس آیت میں ایک عتاب آمیز انداز ہے کہ جس کے ذریعہ مسلمانوں کو دینی تقاضوں سے پہلوتہی پر خبردار کیا گیا ہے۔دورِ صحابہؓ میں یہ کمزوری آج کی نسبت بہت کم تھی بلکہ اُسے ہمارے موجودہ جذبۂ جہاد یا شوقِ شہادت کی کمی سے کوئی نسبت و تناسب ہی نہیں لیکن اُسی کمزوری کو بنیاد بنا کر وہ رہنمائی عطا فرما دی گئی جو ہمیشہ ہمیش کے لئے اُمت مسلمہ کو آمادۂ عمل کرنے، جھنجھوڑنے، جگانے اور شیطان کی تھپکیوں اور لوریوں سے نجات دلانے کے لئے انتہائی مؤثر ہے۔

☆ آیت : **17** :

اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِى الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا -- جان لو کہ اللہ زندہ کرتا ہے زمین کو

اُس کے مرنے کے بعد -- قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿﴾ ہم نے کھول کھول کر بیان کر دی ہیں اپنی نشانیاں تا کہ تم سمجھو۔

- اِس آیت میں اُمید کی ایک کرن دکھائی گئی ہے۔جس طرح زمین مردہ پڑی ہوتی ہے، زندگی کے کوئی آثار نظر نہیں آتے اور ویرانی ہی ویرانی دکھائی دیتی ہے۔ایسے میں بارش برستی ہے، اب سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے، پھر فصلیں لہلہاتی ہیں، اب حشرات الارض بھی آجاتے ہیں اور پرندے بھی چہچہاتے دکھائی دیتے ہیں۔ گویا ہر چہار طرف زندگی کا ایک سماں محسوس ہوتا ہے۔ اِسی طرح امید دلائی جا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے قلوب میں بھی ایمان کی صورت میں ایک حیاتِ تازہ، جذبۂ انفاق، ولولۂ جہاد اور ذوق شہادت پیدا کر سکتا ہے۔
- یہ آیت انسان کو مایوسی سے نکال کر اُس میں ایک جذبۂ عمل پیدا کرتی ہے۔ مایوسی سے انسان میں اصلاح کا امکان ختم جاتا ہے، بقول اقبال :

نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے
امیدِ مردِ مومن ہے خدا کے راز داروں میں

انسان اگر محسوس کرے کہ اُس کے باطن میں اندھیارے ہیں، دل میں نورِ ایمان نہیں، عمل میں جذبۂ انفاق اور جوشِ جہاد نہیں اور تمناؤں میں شوقِ شہادت نہیں تو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ کمرِ ہمت کسے، اصلاح پر آمادہ ہو جائے، اللہ تعالیٰ اُس کے کشتِ قلب میں از سرِ نو ایک حیاتِ تازہ پیدا فرما دے گا اور ایمان اور اعمالِ صالحہ سے اُس کے کردار کی کھیتی لہلہانے لگے گی۔

چمن کے مالی اگر بنالیں موافق اپنا شعار اب بھی
چمن میں آسکتی ہے پلٹ کر چمن سے روٹھی بہار اب بھی

☆ آیت : 18 :

اِنَّ الْمُصَّدِّقِیْنَ وَالْمُصَّدِّقَاتِ -- بے شک صدقہ کرنے والے مرد اور صدقہ کرنے والی عورتیں -- وَاَقْرَضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا -- اور جنہوں نے اللہ کو قرض دیا اچھا قرض -- یُضٰعَفُ لَھُمْ وَلَھُمْ اَجْرٌ کَرِیْمٌ ﴿﴾ دوچند کیا جائے گا اُن کے لئے اِس (انفاق) کو اور اُن کے لئے عزت کا صلہ ہے۔

- اِس آیت میں غفلت سے نکل کر اللہ کی قربت کے حصول کا راستہ بتایا گیا ہے۔ اگر ایک انسان فیصلہ کر لے کہ مجھے اپنی اصلاح کرنی ہے اور اللہ کی رضا حاصل کرنی ہے تو قرآن اُسے ایک ایسی راہ کی رہنمائی عطا کرتا ہے جسے ''سلوکِ قرآنی'' کہا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں کم ہی لوگ ہیں جنہیں تزکیۂ نفس اور قربِ الٰہی کے حصول کی فکر ہوتی ہے۔ پھر جو لوگ اِس طرف متوجہ ہوتے بھی ہیں تو وہ ذکر و شغل، ضربیں لگانے، مراقبے کرنے، آبادیوں سے دور جنگلوں یا پہاڑوں کی کھوہ میں بیٹھ کر ریاضتیں کرنے کو تزکیۂ نفس اور قربِ الٰہی کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اِس حوالے سے قرآنِ حکیم سے رہنمائی حاصل نہیں کی جاتی۔
- قربِ الٰہی کے حصول کے لئے ''سلوکِ قرآنی'' کی شرطِ اوّل یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں اپنی محبوب شے یعنی مال خرچ کرو۔ سورۂ حدید کی اِس آیت میں فرمایا:

اِنَّ الْمُصَّدِّقِیْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا.

''یقیناً صدقہ کرنے والے مرد اور صدقہ کرنے والی عورتیں اور وہ
جو کہ اللہ کو قرضِ حسنہ دیں۔''

- آیت 11 کی وضاحت میں یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ اللہ کی خوشنودی کے حصول کے لئے مال خرچ کرنے کی دو مدات ہیں۔ غریبوں، مسکینوں، بیواؤں، یتیموں، مقروضوں

اور معاشی طور پر کسی بھی اعتبار سے پیچھے رہ جانے والوں کی احتیاج پوری کرنے کے لئے جو مال خرچ کیا جاتا ہے اُسے ''صدقہ'' کہا جاتا ہے۔ اِسی طرح اللہ کے دین کی تبلیغ اور غلبے کے لئے خرچ کیے جانے والے مال کے لئے ''قرضِ حسنہ'' کی اصطلاح آتی ہے۔ دین کی خدمت کے لئے کیے جانے والے انفاق کے نتائج دنیا میں کم ہی نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بندوں کی دلجوئی کے لئے اللہ اِس انفاق کو قرضِ حسنہ قرار دے کر یقین دہانی کرا رہا ہے کہ تمہارا خرچ کیا ہوا مال نہ صرف محفوظ ہے بلکہ اُسے بڑھا چڑھا کر لوٹایا جائے گا اور اِس کے ساتھ ساتھ عزت والا بدلہ بھی دیا جائے گا۔

- اللہ کی قربت کے حصول کے لئے مال خرچ کرنے کا ذکر قرآنِ حکیم میں کئی مقامات پر آیا ہے۔ سورۂ منافقون میں انفاق کو منافقت کا علاج قرار دیا گیا:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْھِکُمْ اَمْوَالُکُمْ وَلَآ اَوْلَادُکُمْ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿﴾ وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰکُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ فَیَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِیْٓ اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِیْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَکُنْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿﴾ وَلَنْ یُّؤَخِّرَ اللّٰہُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُھَا وَاللّٰہُ خَبِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿﴾ (المنافقون : 9 - 11)

''مومنو! کہیں تمہارا مال اور تمہاری اولاد تم کو اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دے اور جو ایسا کرے گا تو وہی لوگ خسارہ اُٹھانے والے ہیں اور ہم نے جو کچھ تمہیں دے رکھا ہے اُس میں سے خرچ کرتے رہا کرو، اِس سے پہلے کہ تم میں سے کسی کی موت آ کھڑی ہو پھر وہ کہنے لگے: ''اے میرے رب! تو نے مجھے کچھ اور مہلت کیوں نہ دی کہ میں خیرات کرتا اور نیک لوگوں میں شامل ہو جاتا؟'' اور جب کسی کی موت آ جاتی ہے تو اللہ اُس کو ہرگز مہلت نہیں دیتا اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اُس سے باخبر ہے۔''

سورۂ توبہ آیت 99 میں فرمایا گیا کہ انفاق فی سبیل اللہ قربِ الٰہی کے حصول کا ذریعہ ہے:

وَمِنَ الاَعۡرَابِ مَنۡ یُّؤۡمِنُ بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَیَتَّخِذُ مَا یُنۡفِقُ
قُرُبٰتٍ عِنۡدَ اللّٰہِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوۡلِ ؕ اَلَاۤ اِنَّہَا قُرۡبَۃٌ لَّہُمۡ

''اور بعض دیہاتی ایسے ہیں کہ اللہ پر اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اُس کو اللہ کی قربت اور رسولؐ کی دعاؤں کا ذریعہ سمجھتے ہیں، بلاشبہ وہ اُن کے لئے قربت کا باعث ہے۔''

سورۂ بقرۃ آیت **177** میں انفاق کو نیکی کا اولین و لازمی مظہر قرار دیا گیا :

لَیۡسَ الۡبِرَّ اَنۡ تُوَلُّوۡا وُجُوۡہَکُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَالۡمَغۡرِبِ وَلٰکِنَّ الۡبِرَّ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَالۡمَلٰٓئِکَۃِ وَالۡکِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ وَاٰتَی الۡمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ ذَوِی الۡقُرۡبٰی وَالۡیَتٰمٰی وَالۡمَسٰکِیۡنَ وَابۡنَ السَّبِیۡلِ وَالسَّآئِلِیۡنَ وَفِی الرِّقَابِ

''نیکی صرف یہی نہیں کہ تم مشرق یا مغرب کی طرف منہ کرلو بلکہ اصل نیکی اُس کی ہے جو ایمان لایا اللہ پر اور روزِ آخرت پر اور فرشتوں پر اور (اللہ کی) کتابوں پر اور رسولوں پر اور محبت کے باوجود مال دیا رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں اور مانگنے والوں کو اور گردنوں (کے آزاد کرانے) میں۔''

یہی مضمون سورۂ آلِ عمران آیت **92** میں اِس طرح بیان ہوا :

لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ

''(مومنو!) جب تک تم اُن چیزوں میں سے جو تمہیں عزیز ہیں (اللہ کی راہ میں) خرچ نہ کرو گے کبھی نیکی حاصل نہ کرسکو گے۔''

سورۂ بلد میں یہ مضمون بڑی ہی صاحت سے اور بڑے ہی مؤثر انداز میں آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے انسان پر اپنی کچھ عنایات کا ذکر فرمایا :

اَلَمۡ نَجۡعَلۡ لَّہٗ عَیۡنَیۡنِ ۙ﴿۸﴾ وَلِسَانًا وَّشَفَتَیۡنِ ۙ﴿۹﴾ وَہَدَیۡنٰہُ النَّجۡدَیۡنِ ۚ﴿۱۰﴾

''کیا ہم نے اُس کو نہیں دیں دو آنکھیں؟ اور زبان اور دو ہونٹ؟ اور اُس کو (خیر و شر

کے) دونوں رستے بھی دکھا دیئے۔'' (البلد : **8 - 10**)

پھر انسان کی ناشکری اور بخل کا نقشہ کھینچا گیا :

فَلَا اقۡتَحَمَ الۡعَقَبَۃَ ۚ﴿۱۱﴾ وَمَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا الۡعَقَبَۃُ ؕ﴿۱۲﴾ فَکُّ رَقَبَۃٍ ۙ﴿۱۳﴾ اَوۡ اِطۡعٰمٌ فِیۡ یَوۡمٍ ذِیۡ مَسۡغَبَۃٍ ۙ﴿۱۴﴾ یَّتِیۡمًا ذَا مَقۡرَبَۃٍ ۙ﴿۱۵﴾ اَوۡ مِسۡکِیۡنًا ذَا مَتۡرَبَۃٍ ؕ﴿۱۶﴾

مگر وہ گھاٹی عبور نہ کرسکا۔ اور تم کیا سمجھو کہ وہ گھاٹی کیا ہے؟ کسی گردن کا چھڑانا یا بھوک کے دن کھانا کھلانا کسی یتیم کو جو کہ قرابت دار بھی ہو اور کسی مسکین کو جو کہ خاک میں رل رہا ہو۔'' (البلد : **11 - 16**)

اِس کے بعد فرمایا کہ اب جب مال کی محبت کا بریک کھل گیا تو ایمان کی دولت سے انسان مالا مال ہوسکے گا :

ثُمَّ کَانَ مِنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ وَتَوَاصَوۡا بِالۡمَرۡحَمَۃِ ؕ﴿۱۷﴾
اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ الۡمَیۡمَنَۃِ ؕ﴿۱۸﴾ (البلد : **17 - 18**)

''پھر ہوا وہ ان لوگوں میں جو ایمان لائے اور جنہوں نے آپس میں ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کی اور آپس میں ایک دوسرے کو باہم رحم اور شفقت کی نصیحت کی۔ یہی لوگ ہیں داہنے ہاتھ والے۔''

یہ ہے سلوکِ قرآنی جس کے مطابق اگر اللہ کی راہ میں مال خرچ کر کے دنیا کی محبت کو قربان کرنے کا مرحلہ طے کرلیا تو اب انسان کے ارتقاء میں، انسان کی روحانی اور اخلاقی ترقی میں، دین کی راہ پر اُس کے آگے بڑھنے میں کوئی رکاوٹ نہ رہے گی۔

- وَلَہُمۡ اَجۡرٌ کَرِیۡمٌ کے الفاظ میں بندوں کے لئے عزت افزائی کا پہلو ہے۔ اللہ کے سامنے ہم سب کی حیثیت بے کس و لاچار فقراء کی سی ہے۔ سورۂ فاطر کی آیت **15** میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اَنۡتُمُ الۡفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰہِ ۚ وَاللّٰہُ ہُوَ الۡغَنِیُّ الۡحَمِیۡدُ ۚ﴿۱۵﴾

''اے لوگو! تم سب اللہ کے در کے فقیر ہو اور اللہ ہی غنی اور بذاتِ خود محمود ہے۔''

اللہ تعالیٰ اپنے فضل میں سے ہمیں جو بھی عطا فرما دے ہم اُس کے محتاج ہیں۔ سورۂ قصص کی آیت **24** میں حضرت موسیٰؑ کے بڑے عاجزانہ الفاظ بیان ہوئے :

رَبِّ اِنِّیۡ لِمَاۤ اَنۡزَلۡتَ اِلَیَّ مِنۡ خَیۡرٍ فَقِیۡرٌ

''اے اللہ تو جو خیر میری جھولی میں ڈال دے میں اُس کا فقیر ہوں۔''

ایک حدیثِ قدسی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

يَا عِبَادِي كُلُّكُمْ جَائِعٌ اِلاّ مَنْ أَطْعَمْتُهُ. فَاسْتَطْعِمُونِي أُطْعِمْكُمْ.

يَا عِبَادِي كُلُّكُمْ عَارٍ اِلاّ مَنْ كَسَوْتُهُ. فَاسْتَكْسُونِي أَكْسُكُمْ

''اے میرے بندو! تم سب بھوکے ہو، سوائے ان کے جن کو میں کھلا دوں۔ لہٰذا تم مجھ سے کھانے کو مانگو، میں تم کو کھانے کے لئے دوں گا۔ اے میرے بندو! تم سب ننگے ہو، سوائے اُن کے جن کو میں پہنا دوں۔ لہٰذا تم مجھ سے پہننے کے لئے طلب کرو، میں تم کو پہننے کے لئے دوں گا۔'' (مسلم)

اِس سب کے باوجود اللہ تعالیٰ ہمیں اجر دیتے ہوئے ہماری عزت افزائی فرمائیے گا۔ یہ اللہ کی اپنے بندوں پر کرم کی انتہا ہے۔

☆ آیت : **19** :

وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖۤ -- اور جو لوگ ایمان لائے اللہ اور اُس کے رسولوںؑ پر -- اُولٰٓئِکَ هُمُ الصِّدِّیۡقُوۡنَ وَالشُّهَدَآءُ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ -- وہی صدیق اور شہید ہیں اپنے رب کے نزدیک -- لَهُمۡ اَجۡرُهُمۡ وَنُوۡرُهُمۡ -- اُن کے لئے اُن کا ثواب اور اُن کا نور ہوگا -- وَالَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا -- اور جن لوگوں نے کفر کیا -- وَکَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَاۤ -- اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا -- اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ الۡجَحِیۡمِ ۞ وہی

جہنم والے ہیں۔

- اِس آیت میں یہ حقیقت بیان کی گئی کہ دل سے دنیا کی محبت نکالنے کے بعد ہی انسان کا باطن ایمان کے نور سے منور ہوگا۔ اللہ کی ذات غیور ہے۔ اُس کی قربت ایسے انسان کو حاصل ہی نہیں ہو سکتی جس کا دل کسی اور شے کی محبت میں گرفتار ہو۔ پہلے دل سے دنیوی خواہشات کی محبتیں نکلیں گی پھر دل میں اللہ کی محبت گھر کرے گی۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلیفہ خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ نے اِس مضمون کو کیا خوب بیان کیا ہے کہ :

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی
اب تو آجا ، اب تو خلوت ہوگئی

- آیت کے اگلے حصہ میں فرمایا کہ جب انسان کو اللہ کی قربت نصیب ہو جائے گی تو اب اُس کا شمار صدیقین اور شہداء میں ہوگا۔ سورۂ نساء آیت **69** کی رو سے ایسے لوگوں کا شمار اُن باسعادت لوگوں میں ہوتا ہے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا :

وَمَنۡ یُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوۡلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَیۡهِمۡ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیۡقِیۡنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِیۡنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیۡقًا ۞

''اور جو کوئی اللہ اور رسول کی اطاعت کرے تو ایسے ہی لوگ (آخرت میں) اُن (مقبول بندوں) کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء اور صدیقین، شہداء اور صالحین اور یہ کیا ہی اچھے رفیق ہیں۔''

- درجات کے اعتبار سے انبیاء کے بعد صدیقین اور شہداء کا مقام و مرتبہ ہے۔ صدیقین یعنی INTROVERTS وہ لوگ ہوتے ہیں جن کا مزاج غور و فکر کرنے والا ہو۔ وہ تنہائی پسند ہوتے ہیں، دروں بینی کی طرف مائل ہوتے ہیں، اپنے من میں ڈوب کر زندگی کا سراغ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور زندگی اور کائنات کے حقائق پر غور کر کے حق کی

معرفت کے حصول کی منزلیں طے کرتے ہیں۔

شہداء یعنی EXTROVERTS ایسے لوگ ہیں جن کے مزاج میں جوش اور حرکت ہو۔انہیں خارج سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔ یہ فعال کردار کے حامل ہوتے ہیں اور حق قبول کرنے کے بعد اُس کی تبلیغ اور غلبے کے لئے سرگرمی سے محنت کرتے ہیں۔

گویا اگر اپنے دلوں کو مال کی محبت سے پاک کرلیا اور اللہ کی راہ میں مال خرچ کیا تو اب اللہ کی قربت کے راستے کھلے ہیں، اپنے مزاج کے اعتبار سے صدیقیت اور شہادت کے مراتبِ عظمیٰ تک پہنچا جاسکتا ہے۔اللہ تعالیٰ ہم سب کو اِس کی توفیق عطا فرمائے۔آمین

- آیت کے اگلے حصہ میں خوشخبری دی گئی کہ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ یعنی اُن کے لئے اجر اور نور محفوظ ہو چکا ہے۔ یہاں لفظ نور بہت اہم ہے۔ یہ وہی نور ہے جس کا ذکر اسی سورۃ کی آیت 12 میں آچکا ہے اور اِسی نور کے ذریعہ روزِ قیامت پل صراط کا کٹھن مرحلہ طے کیا جاسکے گا۔
- آیت کے آخری حصہ میں فرمایا کہ جن لوگوں نے ہماری اِن آیات کا انکار کیا اور اِن کو جھٹلایا تو ایسے ہی لوگ جہنم میں جلنے والے ہوں گے۔ جو لوگ اِن آیات سے استفادہ کرتے ہوئے دولت کی محبت سے اپنے دلوں کو پاک کریں گے وہ جنت میں اعلیٰ مقام حاصل کریں گے اور جو اِن آیات سے اعراض کریں گے وہ جہنم کی آگ کا ایندھن بنیں گے۔اللہ تعالیٰ ہمیں اِس محرومی سے محفوظ فرمائے۔آمین

منتخب نصاب حصّہ ششم

سورۂ حدید حصّہ پنجم : آیات 20 تا 24

حیاتِ دنیا اور اِس کے حوادث

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ O بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ O

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌ ۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِى الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا وَفِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ (20) سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (21) مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِى الْاَرْضِ وَلَا فِىْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِىْ كِتَابٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ (22) لِكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰكُمْ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ (23) اَلَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِىُّ الْحَمِيْدُ (24)

سورۂ حدید کے چوتھے حصہ میں اِس حقیقت کی طرف اشارہ کردیا گیا کہ انسان کی روحانی ترقی

کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ دنیا اور بالخصوص مال کی محبت ہے۔ پہلے اِس محبت کے نتیجہ میں دینی تقاضوں سے غفلت کا بیان آیا اور پھر اِس غفلت سے نکل کر اللہ کی قربت کے حصول کے لئے سلوکِ قرآنی کو واضح کیا گیا۔ اب سورۂ حدید کے پانچویں حصہ میں دو مضامین بیان ہوئے ہیں :

1 - دنیوی زندگی کی حقیقت بیان کی گئی ہے جس کے فریب میں گرفتار ہو کر انسانوں کی اکثریت دینی تقاضوں سے پہلو تہی کرتی ہے اور ہمیشہ ہمیش کی آخرت کی زندگی کو خسارے سے دوچار کر لیتی ہے۔

2 - دنیا میں پیش آنے والے حادثات و واقعات کی حقیقت بیان کی گئی ہے جن کا شدید تأثر لے کر انسان اپنی دینی ذمہ داریوں سے غافل ہو جاتا ہے۔

☆ آیت : **20** :

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا لَعِبٌ -- جان لو کہ دنیا کی زندگی محض کھیل ہے -- وَ لَهْوٌ -- اور تماشا ہے -- وَزِیْنَةٌ -- اور زیب و زینت ہے -- وَتَفَاخُرٌۢ بَیْنَكُمْ -- اور آپس میں بڑائی جتانا ہے -- وَتَكَاثُرٌ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ -- اور مال و اولاد کی کثرت کی ہوس ہے -- كَمَثَلِ غَیْثٍ -- بارش کی مثال کی طرح -- اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ -- اچھی لگتی ہے کسان کو (بارش سے اُگنے والی) کھیتی -- ثُمَّ یَهِیْجُ -- پھر وہ خوب زور پر آتی ہے -- فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا -- پھر (اے دیکھنے والے) تو اُس کو دیکھتا ہے کہ (پک کر) زرد پڑ جاتی ہے -- ثُمَّ یَكُوْنُ حُطٰمًا -- پھر چورا چورا ہو جاتی ہے -- وَفِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِیْدٌ -- اور آخرت میں ہوگا سخت عذاب -- وَ مَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ -- اور اللہ کی طرف سے بخشش اور رضامندی -- وَمَا الْحَیٰوةُ

الدُّنْیَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿﴾ اور دنیا کی زندگی تو ہے ہی دھوکہ کا سامان۔

- سورۂ حدید کی اِس آیت میں اِعْلَمُوْٓا - جان لو کے الفاظ کے ذریعہ بڑی وضاحت کے ساتھ حیاتِ دنیوی کی اصل حقیقت پر سے پردہ اٹھایا گیا ہے جس کے دھوکہ میں آ کر ہم ایمانِ حقیقی، جوشِ جہاد اور جذبۂ انفاق سے تہی دامن ہو جاتے ہیں۔ قرآنِ حکیم میں دیگر مقامات پر دنیوی زندگی کو صرف کھیل تماشا قرار دیا گیا ہے :

وَمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ۭ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ

''اور دنیا کی زندگی نہیں ہے مگر ایک کھیل اور تماشہ اور یقیناً آخرت کا گھر بہتر ہے اللہ کی نافرمانی سے بچنے والوں کے لئے۔'' (الانعام : **32**)

وَمَا هٰذِهِ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْحَیَوَانُ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ﴿﴾

''اور یہ دنیا کی زندگی نہیں ہے مگر ایک تماشا اور کھیل اور بلاشبہ آخرت کا گھر ہے جو ہمیشہ رہنے والا ہے، کاش یہ (لوگ) جان لیتے۔'' (العنکبوت : **64**)

اِنَّمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ۭ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا یُؤْتِكُمْ اُجُوْرَكُمْ

''دنیا کی زندگی تو محض کھیل اور تماشا ہے اور اگر تم ایمان لاؤ گے اور اللہ کی نافرمانی سے بچو تو وہ عطا فرمائے گا تمہیں تمہارا اجر۔'' (محمدؐ : **36**)

اِس آیت میں دنیوی زندگی کو صرف محاورتاً کھیل تماشا نہیں کہا گیا بلکہ اِس کی حقیقت کو واضح کرنے کے لئے تدریج کے ساتھ اِس کے پانچ ادوار بیان کیے گئے ہیں یعنی بچپن، لڑکپن، جوانی، ادھیڑ عمر اور بڑھاپا۔ پھر ہر دور کا ذکر اُس دلچسپی کے ذریعہ کیا گیا ہے جو اُس دور میں انسان کے ذہن پر زیادہ سوار رہتی ہے اور اُسے دیگر ذمہ داریوں سے غافل کر کے اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔

- زندگی کے بالکل ابتدائی دور بچپن کو یہاں لعب یعنی کھیل کہا گیا۔ بلاشبہ یہ دور صرف کھیل

کود سے عبارت ہوتا ہے۔ وہ کھیل کود کہ جس میں معصومیت کا پہلو ہوتا ہے۔ بچے کی تندرستی کا اظہار ہوتا ہی اُس کے معصومانہ کھیل سے ہے۔ اِس کھیل میں کسی لذت یا تماشے کا عنصر شامل نہیں ہوتا۔

- اِس کے بعد زندگی کا دوسرا دور ہے لڑکپن جسے لھو یعنی تماشے سے موسوم کیا گیا۔ یہ زندگی کا وہ دور ہے جس میں انسان کھیل میں ایک لذت محسوس کرتا ہے۔ اُس کی دلچسپی کھیل کے آلات، میدانوں اور تفریح کے مختلف ذرائع کی طرف ہوتی ہے۔ والدین کو اُس کی تعلیم اور تربیت کے لئے بڑی محنت کرنا پڑتی ہے۔ یہ زندگی کا بڑا نازک دور ہوتا ہے۔ انسان کی زندگی کے بننے اور بگڑنے کا فیصلہ اِسی دور میں ہوتا ہے۔ وقت کا درست استعمال، اچھی صحبت اور اچھے اطوار و عادات کا اختیار کرنا انسان کو بنا دیتا ہے۔ اِس کے برعکس صورتِ حال انسان کو بربادی کی طرف لے جاتی ہے۔
- اِس کے بعد زندگی کا تیسرا دور جوانی کا ہے جس کے لئے زینت کے الفاظ آئے۔ اِس دور میں انسان کی توجہ زیب و زینت اور بناؤ سنگھار کی طرف ہوتی ہے۔ انسان اِس حوالے سے بہت حساس (**Conscious**) ہو جاتا ہے کہ میں کیا پہن رہا ہوں اور کیسا لگ رہا ہوں۔ جو چیز انسان کے ذہن پر سب سے زیادہ سوار ہوتی ہے وہ ہے فیشن۔ وہ چاہتا ہے کہ اُس کا لباس، وضع قطع اور تراش خراش فیشن کے مطابق ہو۔ انسان کے اکثر اوقات آئینے کے سامنے کھڑے ہونے اور بننے سنورنے میں صرف ہو جاتے ہیں۔
- زندگی کا چوتھا دور ادھیڑ عمر کا ہے جسے یہاں تَفَاخُرٌ بَیْنَکُمْ یعنی باہم ایک دوسرے پر برتری لے جانے کی خواہش سے تعبیر کیا گیا۔ مال، جائیداد، کاروبار، حیثیت، قابلیت، علم، عزت، وقار، شہرت وغیرہ کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مقابلہ اور آگے نکلنے کی کوشش۔ پچیس سے لے کر چالیس سال کی عمر تک انسان میں مفاخرت کا یہ جذبہ بڑا نمایاں ہوتا ہے۔ اِس کے بعد عمر کی ڈھلوان شروع ہو جاتی ہے۔

- انسانی زندگی کا پانچواں اور آخری دور بڑھاپے کا ہے۔ اِس دور میں تَکَاثُرٌ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ یعنی مال اور اولاد کی کثرت کی ہوس بڑھ جاتی ہے۔ جب انسان کمانے کے قابل نہیں رہتا تو اب سمیٹ سمیٹ کر رکھنے کی خواہش زیادہ ہو جاتی ہے۔ شہری ماحول میں اولاد کی کثرت کی ہوس زیادہ نمایاں محسوس نہیں ہوتی لیکن دیہاتی یا قبائلی معاشرے میں انسان کی عزت کا دارومدار اُس کے بیٹوں کی تعداد پر ہوتا ہے۔ اِس بات کی بڑی اہمیت ہوتی ہے کہ انسان کی عزت، وقار اور آن کا تحفظ کرنے کے لئے کتنے بیٹے اور کتنے ہاتھ موجود ہیں۔ بڑھاپے کی عمر میں آ کر انسان کی نفسیاتی کیفیت میں ایک انقلاب آ جاتا ہے۔ جب وہ تَفَاخُرٌ بَیْنَکُمْ کے دور میں ہوتا ہے تو اکثر لوگوں کا حال یہ ہوگا کہ مال جاتا ہے تو جائے آن نہ جانے پائے اور مونچھ اونچی رہے۔ بڑھاپے میں انسان کی سوچ یہ ہوتی ہے کہ مونچھ نیچی ہوتی ہے تو ہو بلکہ صاف ہی ہو جائے لیکن مال ہاتھ سے نہ جائے۔ سورۂ تکاثر کی ابتدائی دو آیات میں اِس کیفیت کو یوں بیان کیا گیا:

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۞ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۞

''تمہیں غافل کئے رکھا کثرت کی ہوس نے یہاں تک کہ تم قبروں تک جا پہنچے۔''

نبی اکرم ﷺ کے اِس حوالے سے کئی ارشادات ہیں:

لَوْ كَانَ لِابْنِ اٰدَمَ وَادِيَانِ مِنْ مَالٍ لَابْتَغٰى ثَالِثًا وَلَا يَمْلَاُ جَوْفَ ابْنِ اٰدَمَ اِلَّا التُّرَابُ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ تَابَ (بخاری و مسلم)

''اگر آدمی کے پاس مال کے بھرے ہوئے دو میدان اور دو جنگل ہوں، تو وہ تیسرا اور چاہے گا اور آدمی کا پیٹ تو بس مٹی سے بھرے گا (یعنی مال و دولت کی اِس ختم نہ ہونے والی ہوس اور بھوک کا خاتمہ بس قبر میں جا کر ہوگا) اور اللہ اُس بندے پر عنایت اور مہربانی کرتا ہے جو اپنا رخ اور اپنی توجہ اللہ کی طرف کر لے۔''

يَعْرُمُ ابْنُ اٰدَمَ وَيَشِبُّ فِيْهِ اِثْنَانِ اَلْحِرْصُ عَلَى الْمَالِ

وَالْحِرْصُ عَلَى الْعُمُرِ (بخاری ومسلم)

''آدمی بوڑھا ہوجاتا ہے (اور بڑھاپے کے اثر سے اِس کی ساری قوتیں مضمحل ہوکر کمزور پڑجاتی ہے) مگر اُس کے نفس کی دو خصلتیں اور زیادہ جوان اور طاقت ور ہوتی رہتی ہیں۔
ایک دولت کی حرص اور دوسری عمر کی زیادتی کی حرص۔''

لَا یَزَالُ قَلْبُ الْکَبِیْرِ شَابًّا فِیْ اِثْنَیْنِ فِیْ حُبُّ الدُّنْیَا وَطُوْلِ الْاَمَلِ

''بوڑھے آدمی کا دل دو چیزوں کے بارے میں ہمیشہ جوان رہتا ہے
ایک تو دنیا کی محبت اور دوسری لمبی لمبی تمنائیں۔'' (بخاری ومسلم)

بلاشبہ کثرت کی ہوس انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتی، کئی کئی نسلوں کی ضروریات پوری کرنے کے اسباب موجود ہوتے ہیں، انسان قبر میں ٹانگیں لٹکائے بیٹھا ہوتا ہے، لیکن پھر بھی مزید مال واسباب کی آرزو باقی رہتی ہے، بقول مرزا عبدالقادر بیدل:

حرص قانع نیست بیدل ورنہ درکارِ حیات
آنچہ ما درکارِ داریم اکثرش درکارِ نیست

''اے بیدلؔ! حرص قناعت پر آمادہ نہیں ورنہ معاملہ یہ ہے کہ
ہم جن چیزوں کو زندگی گزارنے کے لیے ضروری سمجھتے ہیں، اِن میں
اکثریت ایسی چیزوں کی ہے جو درحقیقت درکار نہیں ہوتیں۔''

- یہ بھی حقیقت ہے کہ زندگی کے اگلے مرحلے میں سابقہ مرحلہ کی خواہشات ومشغولیات انسان کو گھٹیا محسوس ہوتی ہیں۔ اِس حوالے سے مولانا اکبرآلہ آبادی مرحوم ومغفور کا ایک بڑا دلچسپ اور سبق آموز واقعہ ہے۔ اُن کے بچے نے ایک بار اُن سے خواہش کی کہ مجھے ایسی گیند لاکر دیں جس پر گھوڑا بنا ہوا ہو۔ مولانا مطلوبہ گیند بازار میں تلاش کرتے رہے لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ بچہ بڑا ہوگیا اور پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے بیرونِ ملک روانہ ہوگیا۔ مولانا نے اِس دوران بھی مطلوبہ گیند کی تلاش جاری رکھی۔ ایک روز وہ ایسی گیند حاصل

کرنے میں کامیاب ہو ہی گئے جس پر گھوڑے کی تصویر تھی۔ جب اُن کا بیٹا بیرونِ ملک سے تعلیم کی تکمیل کے بعد واپس آیا تو مولانا نے اُس کے اعزاز میں ایک دعوت کا اہتمام کیا اور ساتھ ہی اعلان کردیا کہ وہ اِس دعوت میں اپنے صاحبزادے کو ایک خاص تحفہ دیں گے۔ تمام لوگ حیران تھے کہ وہ خاص تحفہ کیا ہے جو مولانا اپنے صاحبزادے کو دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ دعوت کے روز تمام مہمانوں کے سامنے مولانا نے اپنے بیٹے کو تحفہ کے طور پر وہ گیند پیش کی، جس پر گھوڑا بنا ہوا تھا۔ مولانا کے صاحبزادے کو یہ تحفہ حاصل کرتے ہوئے حدشرمندگی ہوئی کہ والدصاحب مجھے میری اِس عمر میں کیا بچوں والا تحفہ دے رہے ہیں۔ مولانا نے فرمایا کہ بیٹے تمہاری زندگی کا ایک دور وہ بھی تھا جبکہ تم اِس گیند کی شدید خواہش رکھتے تھے اور اِس کے حصول کے لئے ضد کرتے تھے۔ آج تمہیں زندگی کے سابقہ مرحلہ کی خواہش پر شرمندگی ہورہی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ جب تم زندگی کے اگلے مرحلے یعنی آخرت میں پہنچو تو تمہیں اپنی زندگی کی آج کی خواہشات پر شرمندگی ہو۔ لہٰذا اُس روز کی شرمندگی سے بچنے کے لئے آج صرف وہ خواہشات رکھو اور اُن مصروفیات میں وقت لگاؤ جو آخرت میں تمہارے لئے مفید ہوں۔

- آیت کے اگلے حصہ میں دنیا کی زندگی کے لئے بڑی مناسب تمثیل بیان کی گئی ہے۔ دنیا کی زندگی کی مثال ایک کھیتی کی سی ہے جس کا بڑھنا کسان کو بہت اچھا لگتا ہے۔ کھیتی رفتہ رفتہ بڑھتی ہوئی اپنے جوبن کو پہنچتی ہے۔ اِس کے بعد کھیتی پر زوال آتا ہے اور وہ زرد پڑتی ہے، سوکھ جاتی ہے اور چورا چورا ہوجاتی ہے۔ انسان کی دنیوی زندگی بھی بالکل اِس کھیتی کی مانند ہے۔ کھیتی کے اُگنے اور زوال تک پہنچنے کا عمل چند ماہ میں مکمل ہوتا ہے جب کہ انسان کی دنیوی زندگی چند برسوں تک پھیلی ہوتی ہے۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو خوشی کے شادیانے بج رہے ہوتے ہیں۔ جوں جوں وہ بڑا ہوتا ہے اُسے دیکھ کر والدین کا دل باغ باغ ہورہا ہوتا ہے۔ اب وہ شباب کو پہنچتا ہے جو زندگی کا لطف اُٹھانے کی بہترین دور

ہے۔لیکن چار دن کی چاندنی اور پھر اندھیری رات ہے کہ مصداق اب خواہی نخواہی ادھیڑ عمر اور پھر بڑھاپا آتا ہے۔اب وہ توانائی جسم وجان میں نہیں رہتی، اُمنگیں ختم ہو جاتی ہیں، چہرے پر زردی اور بالوں میں سفیدی آجاتی ہے اور پھر وہ وقت بھی آتا ہے کہ انسان کو قبر میں اُتار دیا جاتا ہے۔جس طرح کھیتی چورا چورا ہو کر مٹی پر بکھر جاتی ہے، اِسی طرح انسان کا جسمانی وجود مٹی میں مل کر مٹی ہو جاتا ہے :

مِنۡهَا خَلَقۡنٰكُمۡ وَفِيۡهَا نُعِيۡدُكُمۡ وَمِنۡهَا نُخۡرِجُكُمۡ تَارَةً اُخۡرٰى ﴿﴾

''اِسی (مٹی) سے ہم نے تمہیں پیدا کیا اور اِسی میں تمہیں لوٹائیں گے اور اِسی سے دوسری دفعہ نکالیں گے۔'' (طٰہٰ : 55)

حیاتِ دنیوی کا یہ تسلسل اور اِس کے یہ مختلف ادوار تو آنے ہی ہیں، اِن کو کوئی روکنے والا نہیں ہے، لیکن اصل معاملہ حیاتِ اُخروی کا ہے۔کھیتی پر زوال آیا اور وہ ختم ہوگئی لیکن انسان کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور اب آخرت کی لامحدود زندگی کی ابدی اور مستقل حقیقت کا سامنا کرنا ہوگا :

اب تو گھبرا کہ یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

- آخرت میں تمام انسانوں کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا، اللہ کے سامنے پیش کیا جائے گا اور دنیا کی زندگی کے مختلف امور کے بارے میں باز پرس کی جائے گی۔اِس باز پرس کا ذکر ایک حدیثِ نبوی ﷺ میں اِس طرح ہوا :

لَا تَزُوْلُ قَدَ مَا ابْنِ اٰدَمَ يَوْمَ الْقِيَا مَةِ حَتّٰى يُسْئَلَ عَنْ خَمْسٍ عَنْ عُمُرِهٖ فِيْمَا اَفْنَاهُ وَ عَنْ شَبَابِهٖ فِيْمَا اَبْلَاهُ وَ عَنْ مَّالِهٖ مِنْ اَيْنَ اكْتَسَبَهٗ وَ فِيْمَا اَنْفَقَهٗ وَ مَا ذَا عَمِلَ فِيْمَا عَلِمَ

''روزِ قیامت ابنِ آدم کے قدم ہل نہ سکیں گے جب تک اُس سے پانچ باتوں کے

بارے میں پوچھ نہ لیا جائے۔زندگی کے بارے میں کہ کہاں لگادی، جوانی کے بارے میں کہ کہاں کھپادی، مال کے بارے میں کہ کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا اور جو علم حاصل کیا اُس پر کتنا عمل کیا۔'' (ترمذی)

باز پرس کے بعد آخرت میں دو صورتیں ہوں گی یعنی عَذَابٌ شَدِيۡدٌ – بڑی سخت سزا یا مَغۡفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضۡوَانٌ یا اللہ کی طرف سے بخشش اور اُس کی رضا۔

- آیت کے آخری حصہ میں فرمایا وَمَا الۡحَيٰوةُ الدُّنۡيَاۤ اِلَّا مَتَاعُ الۡغُرُوۡرِ – اور دنیا کی زندگی نہیں ہے مگر دھوکہ کا سامان۔بقول جگر مرادآبادی :

یہ فریبِ حیلہ ہے سر بہ سر
مجھے ڈر ہے اے دلِ بے خبر
کہیں جم نہ جائے تیری نظر
اِنہیں چند نقش و نگار پر

دنیا کی زندگی کی لذتیں اور رعنائیاں بڑی پرکشش ہیں، اِس کی چہل پہل اور اِس کی رونقیں انسان کو اپنی طرف متوجہ کر کے اپنے اندر جذب کر لیتی ہیں۔جو انسان دنیا کی زندگی کے ظاہری حسن جمال کے پھندے میں پھنس گیا اور آخرت کی تیاری سے غافل ہوگیا۔بلاشبہ وہ بہت بڑے خسارے سے دوچار ہوا، ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

قُلۡ هَلۡ نُنَبِّئُكُمۡ بِالۡاَخۡسَرِيۡنَ اَعۡمَالًا ﴿﴾ اَلَّذِيۡنَ ضَلَّ سَعۡيُهُمۡ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَهُمۡ يَحۡسَبُوۡنَ اَنَّهُمۡ يُحۡسِنُوۡنَ صُنۡعًا ﴿﴾ (سورۂ کہف : 103 - 104)

''(اے نبیؐ) اِن سے کہہ دیجئے کیا ہم تمہیں بتائیں سب سے زیادہ خسارے میں رہنے والے کون ہیں اپنے اعمال کے اعتبار سے۔وہ لوگ جن کی ساری محنتیں بھٹک کر رہ جائیں دنیوی زندگی کے لئے اور اور وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم کامیاب ہوگئے۔''

کیا ہے تو نے متاعِ غرور کا سودا

یہ بات پیشِ نظر رہے کہ دنیا کی زندگی دھوکے کا سامان ہے اگر یہ اپنے اندر گم کر لے اور اِس کی وجہ سے انسان آخرت سے غافل ہو جائے۔ یہی زندگی انسان کے لئے آخرت کی کھیتی بن جائے گی اگر وہ یہ سمجھ لے اِس محدود دنیوی زندگی پر آخرت کی طویل زندگی کا انحصار ہے۔ یہاں کی مختصر زندگی میں جو کچھ بویا جائے گا وہی آخرت کی طویل زندگی میں کاٹنا پڑے گا۔ یہاں کا وقتی عمل آخرت میں امر بن جائے گا۔ انسان آخرت کو منزلِ مقصود سمجھ کر یہاں مسافروں کی طرح رہے، جیسے کہ فرمانِ نبوی ﷺ ہے :

كُنْ فِي الدُّنْيَا كَاَنَّكَ غَرِيْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِيْلٍ وَعُدَّ نَفْسَكَ مِنْ اَهْلِ الْقُبُوْرِ

''دنیا میں ایسے رہو گویا کہ تم اجنبی ہو یا راستہ عبور کرنے والے مسافر اور خود کو قبر والوں میں سے شمار کرو۔'' (ترمذی)

خود نبی اکرم ﷺ کا معاملہ دنیا کے حوالے سے یہ تھا کہ آپ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں :

مَالِیْ وَلِلدُّنْیَا مَا اَنَا فِی الدُّنْیَا اِلَّا کَرَاکِبٍ اسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَةٍ ثُمَّ رَاحَ وَتَرَکَهَا

''مجھے دنیا (یعنی دنیا کے ساز و سامان اور اِس کی راحتوں اور لذتوں سے) کیا تعلق اور کیا لینا! میرا تعلق دنیا کے ساتھ بس ایسا ہے، جیسا کہ کوئی سوار مسافر کچھ دیر سایہ لینے کے لئے کسی درخت کے نیچے ٹھہرا، اور پھر اُس کو اپنی جگہ چھوڑ کے منزل کی طرف چل دیا۔'' (مسند احمد، ترمذی، ابن ماجہ)

ایک مسافر کو اپنے راستے سے جتنی دلچسپی ہو سکتی ہے بس اتنی دلچسپی انسان کو دنیا سے رہے۔ اگر دنیا کو منزل سمجھ لیا، یہاں جمنے اور پھیلنے اور پھلنے اور پھولنے ہی کی فکر ذہن پر سوار ہو گئی تو گویا انسان دھوکہ میں آ گیا اور یہی طرزِ عمل ہلاکت و تباہی کا باعث بن سکتا ہے۔ انسان دنیا میں رہے لیکن دنیا کی محبت کو خود پر سوار نہ ہونے دے۔ فارسی کے ایک

شعر میں اِس حقیقت کو کشتی کے پانی کے ساتھ تعلق کی مثال کے ذریعہ واضح کیا گیا کہ :

آب اندر زیرِ کشتی ، کُشتی است
آب در کشتی ، ہلاکِ کشتی است

پانی کشتی کے نیچے رہے تو کشتی کو دھکیل کر آگے بڑھاتا ہے۔ پانی اگر کشتی کے اندر آ جائے تو اُسے غرق کر دیتا ہے۔ دنیا کی زندگی کا معاملہ بھی پانی کی طرح ہے۔ انسان دنیا کی زندگی کو استعمال کر کے آخرت سنوار سکتا ہے لیکن اِس سے جی لگا کر خود کو تباہی سے دوچار کر لیتا ہے۔ لہٰذا انسان کو چاہیئے کہ وہ اِس دنیا میں اپنے اوقات کی حفاظت کرتے ہوئے زندگی اِس طرح گزارے کہ :

دنیا میں ہوں دنیا کا طلب گار نہیں ہوں
بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں

اِس صورت میں یہ دنیا کی زندگی دھوکہ کا سامان نہیں بلکہ انسان کے لئے دارالعمل اور بہت بڑا قیمتی سرمایہ ہے۔ دنیا کی زندگی کی اصل حقیقت سمجھ لینے کا نتیجہ کیا نکلنا چاہیئے؟ اِس کی وضاحت اگلی آیت میں آ رہی ہے۔

☆ آیت : **21** :

سَابِقُوا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ -- ایک دوسرے سے آگے نکلو اپنے رب کی بخشش کے حصول کے لئے -- **وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا کَعَرْضِ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ** -- اور اُس جنت کے حصول کے لئے جس کا پھیلاؤ ہے آسمان اور زمین کے پھیلاؤ جیسا -- **اُعِدَّتْ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ** -- وہ (جنت) جو تیار کی گئی ہے اُن لوگوں کے لئے جو ایمان لائے اللہ اور اُس کے رسولوںؑ پر -- **ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَاءُ** -- وہ اللہ کا فضل ہے وہ دیتا ہے اِسے جسے وہ چاہے -- **وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ**

الْعَظِیْمِ ﴿﴾ اوراللہ بڑے فضل والا ہے۔

- مسابقت یعنی ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی خواہش انسان کی فطرت میں ہے۔ عام طور پر لوگ اِس خواہش کے تحت دنیوی نعمتوں کے حصول کے لئے ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے ہیں۔ مال، جائداد، کارخانے، گاڑیاں، سہولیات اور آسائشوں کے اعتبار سے ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ قرآنِ حکیم ہمیں یہ ہدایت دیتا ہے کہ ہم اِس خواہش کا میدان بدل دیں۔ ہم نیکیوں میں اور آخرت کی نعمتوں کے حصول کے لئے ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کریں۔ قرآنِ حکیم میں یہ مضمون کئی بار آیا ہے :

وَلِکُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَافَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ (البقرۃ : **148**)

''ہر ایک کا ہدف ہے جس کی طرف وہ رُخ کیے ہوئے ہے پس تم ایک دوسرے سے بازی لے جاؤ نیکیوں میں۔''

سورۂ انبیاء آیت **90** میں حضراتِ انبیاء کے بارے میں فرمایا گیا :

اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ۭ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ﴿﴾

''وہ نیکیوں میں تیزی سے ایک دوسرے سے آگے نکلتے تھے اور ہمیں اُمید اور خوف سے پکارتے تھے اور ہمارے سامنے عاجزی اختیار کرنے والے تھے۔''

سورۂ مطففین میں جنت کی نعمتوں کے تذکرہ کے بعد فرمایا :

وَفِیْ ذٰلِکَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ﴿﴾ (المطففین : **26**)

''چاہیئے کہ (جنت کی) اِن نعمتوں کے حصول کے لئے مقابلہ کریں مقابلہ کرنے والے۔''

نبی اکرم ﷺ نے بھی نصیحت فرمائی کہ دنیا میں کم تر لوگوں پر نگاہ رکھو اور دین میں اُن سے مقابلہ کرو جو تم سے آگے ہیں :

اِذَا نَظَرَاَحَدُکُمْ اِلٰی مَنْ فُضِّلَ عَلَیْهِ فِی الْمَالِ وَالخَلْقِ فَلْیَنْظُرْ اَلٰی مَنْ هُوَ

اَسْفَلُ مِنْهُ (بخاری ومسلم)

''جب تم میں سے کوئی ایسے شخص کو دیکھے جو مال و دولت اور جسمانی بناوٹ، یعنی شکل وصورت میں اِس سے بڑھا ہوا ہو (اور اِس کی وجہ سے اُس کے دل میں حرص وطمع اور شکایت پیدا ہو) تو اُس کو چاہیئے کہ کسی ایسے بندہ کو دیکھے، جو اِن چیزوں میں اُس سے بھی کمتر ہو (تاکہ بجائے حرص وطمع اور شکایت کے صبر وشکر پیدا ہو)۔''

خَصْلَتَانَ مَنْ کَانَتَا فِیْهِ کَتَبَهُ اللّٰهُ شَاکِرًا صَابِرًا، مَنْ نَظَرَ فِیْ دِیْنِهٖ اِلٰی مَنْ هُوَ فَوْقَهٗ فَا قْتَدٰی بِهٖ وَنَظَرَ فِیْ دُنْیَاهُ اِلٰی مَنْ هُوَدُوْنَهٗ فَحَمِدَ اللّٰهَ عَلٰی مَا فَضَّلَهٗ اللّٰهُ عَلَیْهِ کَتَبَهٗ اللّٰهُ شَاکِرًا صَابِرًا وَمَنْ نَظَرَفِیْ دِیْنِهٖ اِلٰی مَنْ هُوَ دُوْنَهٗ وَنَظَرَ فِیْ دُنْیَا هُ اِلٰی مَنْ هُوَ فَوْقَهٗ فَاَسِفَ عَلٰی مَا فَاتَهٗ مِنْهُ لَمْ یَکْتُبْهُ اللّٰهُ شَاکِرًا وَلَا صَابِرًا (ترمذی)

''جس شخص میں دو خصلتیں ہوں گی اللہ تعالیٰ اُس کو شاکرین اور صابرین میں لکھیں گے (اِن دو خصلتوں کی تفصیل یہ ہے کہ) جس شخص کی یہ عادت ہو کہ وہ دین کے معاملے میں تو اللہ کے اُن بندوں پر نظر رکھے جو دین میں اُس سے فائق اور بالاتر ہوں اور اُن کی پیروی اختیار کرے اور دنیا کے معاملے میں اُن غریب ومسکین اور خستہ حال بندوں پر نظر رکھے جو دنیوی حیثیت سے اُس سے بھی کمتر ہوں، اور اِس پر اللہ کا شکر ادا کرے کہ اُس نے محض اپنے فضل وکرم سے اِن بندوں سے زیادہ دنیا کی نعمتیں اُس کو دے رکھی ہیں، تو اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ صابر وشاکر لکھا جائے گا اور جس کا حال یہ ہو کہ دین کے بارے میں تو ہمیشہ اپنے سے ادنیٰ درجے کے لوگوں کو دیکھے اور دنیا کے بارے میں اپنے سے بالاتر لوگوں پر نظر ہو اور جو دنیوی نعمتیں اُس کو نہیں ملی ہیں اُن کے نہ ملنے پر افسوس اور رنج کرے، تو اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ شاکر وصابر نہیں لکھا جائے گا۔''

دنیا میں کم تر کو دیکھنے سے اللہ کے لئے شکر کے جذبات پیدا ہوتے ہیں کہ مجھے اللہ نے بہتر حالات میں رکھا ہے اور اپنی کسی مشکل پر صبر کی کیفیت بھی پیدا ہوتی ہے کہ دوسرا مجھ سے بھی زیادہ مشکل حالات میں ہے۔ شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ اپنی سیاحت کے دوران ایسا مرحلہ بھی آیا کہ میرے پاؤں میں جوتے نہیں تھے۔ دل میں خیال آیا کہ پروردگار نے لوگوں کو کیا کیا نعمتیں دی ہیں اور میرے پاؤں میں جوتے تک نہیں۔ آگے جا کر ایک ایسے شخص پر نگاہ پڑی جس کے پاؤں ہی نہیں تھے۔ میں نے فوراً توبہ و استغفار کی اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ میرے پاؤں تو سلامت ہیں۔

صحابہ کرامؓ ہر معاملہ میں مذکورہ بالا ہدایات پر عمل کی کوشش فرماتے تھے۔ غزوۂ تبوک کے موقع پر مسلمانوں نے صدقہ و خیرات کرنے میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی بے نظیر مثالیں پیش کیں۔ حضرت عمر فاروقؓ اپنا آدھا مال لے کر نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اِس امید کے ساتھ کہ وہ اِس موقع پر حضرت ابوبکر صدیقؓ سے سبقت لے جائیں گے۔ لیکن اُن کی یہ نیک خواہش پوری نہ ہوسکی کیونکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنا پورا مال پیش کر چکے تھے اور گھر پر صرف اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کا نام چھوڑ آئے تھے:

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیقؓ کے لئے ہے خدا کا رسولؐ بس

- اِس آیت میں ہمیں دعوت دی گئی کہ ہم اپنا ہدف بنائیں آخرت میں بخشش اور جنت کے حصول کو۔ جنت بھی وہ جس کا پھیلاؤ آسمان اور زمین جتنا ہے۔ دنیا میں اکثر لوگوں کی زندگی بھر کی کمائی کا حاصل ایک مکان ہوتا ہے۔ یہ مکان خواہ کتنا ہی بڑا ہو لیکن اِس کے رقبہ کا جنت کے پھیلاؤ سے کوئی موازنہ نہیں ہوسکتا۔ پھر اِس مکان کی سہولیات کم تر بھی ہیں اور عارضی بھی جبکہ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى (الاعلیٰ :17) کے مصداق جنت کی نعمتیں

بہتر بھی ہیں اور دائمی بھی۔ حدیثِ قدسی ہے:

اَعْدَدتُّ لِعِبَادِیَ الصّٰلِحِیْنَ مَالَا عَیْنٌ رَ اَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَاخَطَرَ عَلٰی قَلْبِ بَشَرٍ'' وَاقْرَءُ وْا اِنْ شِئْتُمْ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ

''میں نے اپنے نیک بندوں کے لئے وہ نعمتیں تیار کی ہیں جنہیں نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے اُن کا ذکر سنا اور نہ ہی کسی دل پر اُن کا خیال گزرا،، (آپؐ نے فرمایا) اگر تم چاہو تو پڑھ لو فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ (کسی انسان کو نہیں معلوم کہ کیسی آنکھوں کی ٹھنڈک اُس کے لئے پوشیدہ رکھی گئی ہے۔ سورۂ السجدہ :17) (بخاری، مسلم)

اِسی لئے نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

اَلْکَیِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهٗ وَ عَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ

''عقل مند وہ ہے جو اپنے نفس پر قابو پالے اور عمل کرے موت کے بعد کی زندگی کے لئے۔'' (ترمذی، ابن ماجہ)

- آیت کے اگلے حصہ میں جنت کے بارے میں آگاہ کیا گیا کہ اُعِدَّتْ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ – وہ تیار کی گئی ہے اُن کے لئے جو ایمان لائے اللہ پر اور اُس کے رسولوں پر۔ یہاں ایمان سے مراد حقیقی یعنی قلبی ایمان ہے جس کا نتیجہ انسان کے نیک اعمال کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اِس نکتہ کی تفسیر خود قرآن نے سورۂ آلِ عمران آیات میں اِس طرح کی:

وَسَارِعُوْا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ ۞ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ۞ وَالَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ص وَمَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ص وَلَمْ یُصِرُّوْا عَلٰی مَا فَعَلُوْا وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ ۞ (آلِ عمران 133 - 135)

''اور ایک دوسرے سے تیزی دکھاؤ اپنے رب کی بخشش اور اُس جنت کے حصول کے لئے جس کا عرض آسمان اور زمین کے برابر ہے اور جو تیار کی گئی ہے اللہ کی نافرمانی سے بچنے والوں کے لئے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو آسودگی اور تنگی میں (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں اور غصے کو روکتے ہیں اور لوگوں کے قصور معاف کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نیکوکاروں سے محبت کرتا۔ اور جب وہ کوئی کھلی بے حیائی کر بیٹھتے ہیں یا اپنے حق میں کسی بُرائی کا ارتکاب کرتے ہیں تو اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کی بخشش مانگتے ہیں اور اللہ کے سوا گناہ بخش بھی کون سکتا ہے؟ اور وہ جان بوجھ کر اَڑے نہیں رہتے اپنے کسی (برے) عمل پر جو اُنہوں نے کیا۔''

- آیت کے آخر میں فرمایا ذٰلِکَ فَضۡلُ اللّٰہِ یُؤۡتِیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ وَاللّٰہُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِیۡمِ - یہ اللہ کا فضل ہے وہ دیتا ہے یا دے گا جسے چاہے گا اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔ فضل سے مراد ہے اللہ کی طرف سے بغیر استحقاق کے دی جانے والی شے۔ اِس کے بالمقابل اجرت اور اجر کے الفاظ عام استعمال ہوتے ہیں جو باہم مترادفات ہیں۔ اِن کا مطلب ہے بدلہ، جو کسی محنت اور مزدوری کا نتیجہ ہوتا ہے۔ قرآنِ حکیم میں اکثر جنت کے حصول کو اللہ کا فضل کہا گیا ہے۔ گویا انسان صرف اپنے عمل کے ذریعے جنت کا مستحق نہیں بن سکتا۔ مراد یہ ہے کہ تم محنت کرو اور دین کے لئے مال و جان کی قربانی دو لیکن جان لو جنت پھر بھی اللہ کے فضل سے ملے گی نہ کہ تمہارے عمل سے۔ ارشادِ نبوی ﷺ ہے :

لَا یُدۡخِلُ اَحَدًا مِنۡکُمۡ عَمَلُہُ الۡجَنَّۃَ وَلَایُجِیۡرُہُ مِنَ النَّارِ وَلَا اَنَا اِلَّا بِرَحۡمَۃَ اللّٰہِ (مسلم)

''تم میں سے کسی کا عمل اُس کو جنت میں نہیں لے جا سکے گا، اور نہ دوزخ سے بچا سکے گا اور میرا بھی یہی حال ہے مگر اللہ کی رحمت اور اُس کے کرم سے۔''

☆ آیت : 22 :

مَآ اَصَابَ مِنۡ مُّصِیۡبَۃٍ فِی الۡاَرۡضِ -- نہیں پڑتی کوئی آفت زمین پر -- وَلَا فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ -- اور نہ ہی خود تم پر -- اِلَّا فِیۡ کِتٰبٍ -- مگر ایک کتاب میں (لکھی ہوئی) ہے -- مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ نَّبۡرَاَھَا -- قبل اِس کے کہ ہم اُسے ظاہر کریں -- اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیۡرٌ ۞ بے شک ایسا کرنا اللہ کے لئے آسان ہے۔

اِس آیت میں اُن حوادث کے حوالے سے ایمان افروز ہدایت دی گئی ہے جن کے اثرات انسانی زندگی پر اِس طرح اثر انداز ہوتے ہیں کہ وہ اپنی دینی ذمہ داریوں کی ادائیگی سے محروم ہو جاتا ہے۔ حوادث کے لئے یہاں لفظ ''مصیبت'' آیا ہے جس کے لغوی معنی ہیں وارد ہونے والی شے خواہ وہ خوشگوار ہو یا تکلیف دہ۔ عام طور پر تکلیف دہ معاملہ کا انسان زیادہ تأثر لیتا ہے لہٰذا ''مصیبت'' کا لفظ اکثر صرف اِسی صورت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ خوشگوار یا تکلیف دہ حوادث زمین پر بھی وارد ہوتے ہیں اور کسی انسان پر بھی۔ زمین پر اِس کی صورت بارانِ رحمت، فرحت بخش ہواؤں اور اچھی فصلوں یا زلزلے، طوفانی بارشوں، ژالہ باری، سیلاب، سمندری طوفان، تیز ہواؤں، خراب فصلوں وغیرہ کی ہوتی ہے۔ انسان پر اِس کا ورود کامیابیوں یا ناکامیوں، مال و جان کے نقصان اور بیماریوں کی صورت میں ہوتا ہے۔ اِس آیت میں رہنمائی عطا کی گئی کہ :

1- زمین اور انسانوں پر وارد ہونے والے حوادث اللہ کے حکم سے وارد ہوتے ہیں۔ کائنات کی تخلیق اور اِس میں جاری مختلف معاملات کسی اندھے بہرے مادّہ کی کارفرمائی نہیں ہیں۔ ایک حکیم و دانا ہستی اِس کائنات کی خالق ہے۔ یہاں کچھ ہو رہا ہے اُس کے اذن سے ہو رہا ہے۔ دنیا میں نہ کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ فائدہ، جب تک اللہ کا اذن نہ ہو۔ ترمذی میں روایت ہے کہ نبی اکرمؐ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو تاکید فرمائی :

اِذَا سئَلْتَ فَاسْئَلِ اللّٰہَ، وَاِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ باللّٰہِ؛ وَاعْلَمْ اَنَّ الاُمَّۃَ لَوِ اجْتَمَعَتْ عَلٰی اَنْ یَّنْفَعُوْکَ بِشَیْءٍ لَمْ یَنْفَعُوْکَ اِلَّا بِشَیْءٍ قَدْ کَتَبَہُ اللّٰہُ لَکَ، وَاِنِ اجْتَمَعُوْا عَلٰی اَنْ یَّضُرُّوْکَ بِشَیْءٍ لَّمْ یَضُرُّوْکَ اِلَّا بِشَیْءٍ قَدْ کَتَبَہُ اللّٰہُ عَلَیْکَ، رُفِعَتِ الاَقْلاَمُ وَجَفَّتِ الصُّحُفُ

''جب تو سوال کرتو صرف اللہ سے سوال کر، جب تو مدد چاہے تو اللہ ہی سے مدد طلب کر، اور یہ بات جان لے کہ اگر سب لوگ جمع ہو کر تجھے فائدہ پہنچانا چاہیں تو نہیں پہنچا سکتے مگر وہی جو اللہ نے طے کر دیا اور اگر وہ جمع ہو کر تجھے نقصان پہنچانا چاہیں تو نہیں پہنچا سکتے مگر وہی جو اللہ نے طے کر دیا۔ قلم اٹھائے جا چکے ہیں اور صحیفے خشک ہو چکے ہیں''۔

ہر واقعہ کے پیچھے بظاہر کچھ اسباب نظر آتے ہیں لیکن اسباب کی کوئی حقیقت نہیں۔ اصل حقیقت اللہ تعالیٰ کے حکم کی ہے۔ جو بھی حالات وارد ہو رہے ہیں، اُن میں بظاہر کوئی بھلائی یا برائی اپنے لئے کما رہا ہے لیکن اِن کے پیچھے اصل فاعلِ حقیقی صرف اور صرف اللہ ہے۔ ممکن ہے کہ کسی ڈاکٹر نے غلط انجکشن لگا دیا ہو، ممکن ہے کہ کسی نے وار کیا ہو اور انسان اُس وار سے ہلاک ہو گیا، لیکن یہ سب کا سب ہو نہیں سکتا تھا جب تک اللہ تعالیٰ کا اذن نہ ہو۔ موت کا وقت اللہ تعالیٰ نے طے کر رکھا ہے۔ جب تک موت کا وقت نہیں آیا، انسان مر نہیں سکتا۔ حضرت علیؓ کا بڑا حکیمانہ قول ہے :

اَلْمَوْتُ خَیْرُ الْحَافِظَۃِ وَالْمَوْتُ خَیْرُ الْوَاعِظَۃِ

''موت بہترین محافظ ہے اور موت بہترین واعظ ہے۔''

موت محافظ اِس معنی میں ہے کہ اِس کا وقت طے ہے لہٰذا جب تک اِس کا وقت نہیں آیا، کوئی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ موت بہترین واعظ ہے یعنی اگر انسان کو موت یاد رہے تو پھر اُس کی زندگی کا رخ صحیح ہو جاتا ہے۔

2- جو واقعات بھی ظہور پذیر ہو رہے ہیں وہ پہلے سے ایک کتاب یعنی کتابِ تقدیر میں لکھے

ہوئے ہیں۔ بظاہر یہ معاملہ مشکل نظر آتا ہے لیکن واضح کیا گیا کہ اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرٌ - بے شک یہ اللہ پر بہت آسان ہے۔ اگر اللہ کی ذات وصفات کی بے حد وحساب وسعت سامنے ہو تو اِس حوالے سے کوئی تعجب نہ ہوگا۔

مذکورہ بالا دو حقائق سامنے ہوں تو اِس کا جو نتیجہ ظاہر ہوتا ہے وہ اگلی آیت میں بیان ہوا۔

☆ آیت : 23 :

لِکَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ -- تاکہ تم افسوس نہ کرو اُس پر جو شے تمہارے ہاتھ سے جاتی رہے -- وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَا اٰتَاکُمْ -- اور نہ اترا ؤ اُس پر جو تم کو وہ (اللہ) عطا کرے -- وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۞ اور اللہ پسند نہیں کرتا خود کو کچھ سمجھنے والے اور بڑائی کرنے والے کو۔

حیاتِ دنیوی کے دوران ہر انسان کو بدلتے ہوئے حالات سے سابقہ پیش آتا ہے۔ تکلیف دہ واقعات بھی رونما ہوتے رہتے ہیں اور مسرت بخش لمحات بھی آتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تین عالم بنائے ہیں۔ ایک یہ دنیا کا عالم ہے، دوسرا عالمِ جنت ہے اور تیسرا عالمِ جہنم۔ جنت ایسا عالم ہے جہاں راحتیں ہی راحتیں ہیں۔ جہنم ایسا عالم ہے کہ جہاں پر تکالیف ہی تکالیف ہیں۔ عالمِ دنیا میں راحتیں بھی ہیں اور تکالیف بھی۔ دونوں چیزیں ساتھ ساتھ چلتیں ہیں۔ تکلیف یا راحت مسلمان کو بھی پہنچتی ہے اور کافر کو بھی۔ البتہ اِس حوالے سے ایک مسلمان اور ایک کافر کے ردِّ عمل میں فرق ہونا چاہیئے۔ اِس لئے کہ مسلمان اللہ اور تقدیر پر ایمان رکھتا ہے جبکہ کافر اِس نعمت سے محروم ہے۔ مسلمان جب اِس حقیقت پر غور کرتا ہے کہ ہر معاملہ اللہ ہی کے حکم سے ظہور پذیر ہوا اور کتابِ تقدیر میں وہ پہلے ہی سے درج تھا تو اب نہ وہ ناخوشگوار حالات پر شدتِ غم سے نڈھال ہوتا ہے اور نہ ہی کسی کامیابی پر اتراتا واکڑتا ہے۔ اُس کی وجہ مذکورہ بالا دو نکات کے حسبِ ذیل مضمرات ہیں :

1- عام آدمی کو اگر کوئی تکلیف آتی ہے تو وہ اِسے کسی دیوتا کی ناراضگی یا اسباب کے مخالف

ہونے کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ اگر اُسے کوئی خوشی نصیب ہوتی ہے تو اِسے کسی دیوتا کی نظرِ کرم یا اسباب کے موافق ہونے کا ثمرہ قرار دیتا ہے۔ کسی بھی واقعہ کے ظہور کو غیر اللہ کی طرف منسوب کرنا بہت بڑی گمراہی ہے۔ ہدایت کی طرف پہلا قدم یہ ہے کہ اِسے اللہ کی طرف منسوب کیا جائے۔ وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى کے مطابق ہر نعمت اللہ دیتا ہے اور تکلیف بھی وہی دیتا ہے۔ خیر ہو یا شر، خوشگوار حالات ہوں یا ناگوار، جو بھی ہے من جانب اللہ ہے۔ سب کچھ اللہ کے حکم سے ہوا، لہٰذا نقصان کی صورت میں اسباب کے خلاف پیچ و تاب اور انتقام کے جذبات سرد پڑ جاتے ہیں۔ اِسی طرح اگر کوئی خیر ملی ہے تو وہ اللہ کا فضل ہے نہ کہ انسان کا اپنا کمال۔ لہٰذا انسان میں نہ تکبر کا احساس پیدا ہوتا ہے اور نہ ہی وہ اتراتا اور اپنی بڑائی کرتا ہے۔

2- اِس کائنات میں وقوع پذیر ہونے والے تمام معاملات پہلے ہی سے طے شدہ اور علمِ خداوندی میں موجود ہیں۔ لہٰذا یہاں کوئی واقعہ ممکن ہے ہمارے لئے حادثہ ہو، درحقیقت حادثہ نہیں ہے۔ کوئی بات انہونی نہیں ہے۔ جو تکلیف آئی ہے وہ اپنے طے شدہ وقت پر آنی ہی تھی اور تقدیر میں لکھا کوئی نہیں ٹال سکتا۔

3 - اللہ کے ہر فیصلہ میں ضرور کوئی خیر پوشیدہ ہے۔ سورۂ آلِ عمران آیت **26** میں فرمایا گیا:

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ط بِيَدِكَ الْخَيْرُ ط اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۞

''کہو کہ اے اللہ (اے) بادشاہی کے مالک تو جس کو چاہے بادشاہی بخشے اور جس سے چاہے بادشاہی چھین لے اور جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلیل کرے ہر طرح کی بھلائی تیرے ہی ہاتھ ہے، بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔''

ہم اپنے ناقص علم کی وجہ سے اللہ کے فیصلہ کے خیر کے پہلو کو سمجھ نہیں سکتے لیکن اللہ کے

فیصلہ میں ضرور ہماری بہتری ہوتی ہے:

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ج وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ج وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ط وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۞

''تم پر (اللہ کی راہ میں) لڑنا فرض کر دیا گیا ہے خواہ وہ تمہیں ناگوار ہو، ممکن ہے تم کسی شے کو ناپسند کرو اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو اور ممکن ہے تم کسی شے کو پسند کرو اور وہ تمہارے لئے نقصان دہ ہو اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔'' (البقرۃ: **216**)

سورۂ توبہ میں منافقین کو اہلِ ایمان کی طرف سے آگاہ کیا گیا:

قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ج هُوَ مَوْلٰنَا ج وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۞ قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ط وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖٓ اَوْ بِاَيْدِيْنَا ق فَتَرَبَّصُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ ۞ (التوبہ: **51 - 52**)

''(اے نبیؐ) کہہ دیجئے ہمیں ہرگز نہ پہنچے گا مگر وہی جو لکھ دیا اللہ نے ہمارے لئے۔ وہی ہمارا کارساز ہے اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیئے۔ کہہ دیجئے کہ تم کیا امید کرو گے ہمارے حق میں مگر دو بھلائیوں میں سے ایک کی اور ہم تمہارے حق میں منتظر ہیں کہ بھیجے اللہ تم پر کوئی عذاب اپنے پاس سے یا ہمارے ہاتھوں۔ سو انتظار کرو ہم بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتے ہیں۔''

حدیثِ مبارکہ ہے:

عَجَباً لِاَمْرِ الْمُؤْمِنِ اِنَّ اَمْرَهٗ كُلَّهٗ خَيْرٌ وَلَيْسَ ذٰلِكَ لِاَحَدٍ اِلَّا لِلْمُؤْمِنِ اِنْ اَصَابَتْهُ سَرَّآءُ شَكَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَّهٗ وَاِنْ اَصَابَتْهُ ضَرَّآءُ صَبَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَّهٗ

''مومن کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ اُس کے ہر معاملے میں خیر ہے اور یہ چیز مومن کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں، اگر اُسے نعمت ملے وہ شکر کرتا ہے تو یہ اُس کے لئے بہتر ہے اور اگر

اُسے تکلیف پہنچے وہ صبر کرے تو یہ اُس کے لئے بہتر ہے''۔(مسلم)

اللہ تعالیٰ ہمارا ہم سے بڑھ کر خیر خواہ اور ہماری مصلحتوں کا ہم سے بہتر جاننے والا ہے :

کار سازِ ما بفکرِ کارِ ما

فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما

''ہمارا کارساز ہمارے مسائل کے حل کا دھیان رکھتا ہے۔ ہمارا بذاتِ خود

اپنے مسائل کے حل کے بارے میں متفکر ہونا ہمیں پریشان کر دیتا ہے۔''

ہمیں اِس دنیا میں جو بھی تکلیف پہنچتی ہے، اگر ہم نے اُس پر صبر کیا تو وہ روزِ قیامت ہمارے گناہوں کا کفارہ اور ہمارے حق میں باعثِ اجر وثواب ہوگی۔ ارشاداتِ نبویؐ ہیں :

مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّصِبْ مِنْهُ

''جس بندے کے بارے میں اللہ خیر کا فیصلہ فرماتا ہے،

اُسے مصیبت سے دوچار کر دیتا ہے۔'' (بخاری)

اِذَا اَرَادَ اللّٰهُ بِعَبْدِهِ الْخَيْرَ عَجَّلَ لَهُ الْعُقُوْبَةَ فِي الدُّنْيَا، وَاِذَا اَرَادَ بِعَبْدِهِ الشَّرَّ اَمْسَكَ عَنْهُ بِذَنْبِهٖ حَتّٰى يُوَافِيَ بِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: اِنَّ عِظَمَ الْجَزَآءِ مَعَ عِظَمِ الْبَلَاءِ، وَاِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى اِذَا اَحَبَّ قَوْماً ،اِبْتَلَاهُمْ، فَمَنْ رَضِيَ فَلَهُ الرِّضٰى، وَمَنْ سَخِطَ فَلَهُ السُّخْط

''جب اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اُس کو (اُس کے گناہوں کی سزا) جلد ہی دنیا میں دے دیتا ہے (یعنی تکلیفوں اور آزمائشوں کے ذریعے سے اُس کے گناہوں کی معافی کا سامان پیدا کر دیتا ہے) اور جب اپنے بندے کے ساتھ برائی کا ارادہ کرتا ہے تو اُس سے اُس کے گناہ کی سزا (دنیا میں) روک لیتا ہے، یہاں تک کہ قیامت والے دن اُس کو پوری سزا دے گا۔ نبی ﷺ نے مزید فرمایا آزمائش جتنی عظیم ہوگی، بدلہ بھی اِسی قدر عظیم ہوگا اور اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو پسند فرماتا ہے تو اُس

کو آزمائش سے دوچار فرما دیتا ہے، پس جو (اُس سے) راضی ہوتا ہے، اُس کے لئے (اللہ کی) رضا ہے اور جو (اُس کی وجہ سے اللہ سے) ناراض ہوتا ہے، اُس کے لئے (اللہ کی) ناراضی ہے۔'' (ترمذی)

يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى، مَا لِعَبْدِيَ الْمُؤْمِنِ عِنْدِيْ جَزَاءٌ اِذَا قَبَضْتُ صَفِيَّهٗ مِنْ اَهْلِ الدُّنْيَا ثُمَّ احْتَسَبَهٗ اِلَّا الْجَنَّةُ

''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، میرا وہ مومن بندہ جس کی محبوب ترین چیز میں واپس لے لوں، لیکن وہ اُس پر ثواب کی نیت سے (صبر ورضا کا مظاہرہ کرے) اُس کے لئے میرے پاس جنت کے سوا کوئی بدلہ نہیں ہے۔'' (بخاری)

مَا يُصِيْبُ الْمُسْلِمَ مِنْ نَصَبٍ وَّلَا وَصَبٍ وَّلَا هَمٍّ وَّلَا حُزْنٍ وَّلَا اَذًى وَّلَا غَمٍّ حَتَّى الشَّوْكَةِ يُشَاكُهَا اِلَّا كَفَّرَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ خَطَايَاهُ

''مسلمان کو جو بھی تکان، بیماری، فکر، غم اور تکلیف پہنچتی ہے، حتّٰی کہ کانٹا بھی چبھتا ہے تو اِس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اُس کے گناہ معاف فرما دیتا ہے۔'' (بخاری ومسلم)

اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا سَبَقَتْ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ مَنْزِلَةٌ لَمْ يَبْلُغْهَا بِعَمَلِهٖ، اِبْتَلَاهُ اللّٰهُ فِيْ جَسَدِهٖ اَوْ فِيْ مَالِهٖ اَوْ فِيْ وَلَدِهٖ ثُمَّ صَبَّرَهٗ عَلٰى ذٰلِكَ حَتّٰى يُبْلِغَهُ الْمَنْزِلَةَ الَّتِيْ سَبَقَتْ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى (مسند احمد ، ابوداؤد)

''کسی بندۂ مؤمن کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا بلند مقام طے ہو جاتا ہے جس کو وہ اپنے عمل (مجاہدے) سے نہیں پا سکتا تو اللہ تعالیٰ اُس کو کسی جسمانی یا مالی تکلیف میں یا اولاد کی طرف سے کسی صدمہ یا پریشانی (غیر اختیاری مجاہدے) میں مبتلا کر دیتا ہے، پھر اُس کو صبر کی توفیق دے دیتا ہے، یہاں تک کہ اُسے اُس بلند مقام پر پہنچا دیتا ہے جو اُس کے لئے پہلے سے طے ہو چکا ہوتا ہے''۔

سورۂ کہف میں ایک قصہ کے ذریعہ واضح کیا گیا کہ واقعات کا ظاہر کچھ ہوتا ہے لیکن اُن

کی حقیقت کچھ اور ہوتی ہے۔ اِس قصہ میں تین واقعات ایسے آئے ہیں کہ جن کا ظاہر شر محسوس ہو رہا تھا لیکن اُن کی حقیقت خیر تھی۔ حضرت موسیٰؑ ، حضرت خضرؑ کے ساتھ ایک کشتی میں سفر کر رہے تھے۔ حضرت خضرؑ نے کشتی کا ایک تختہ نکال کر پھینک دیا۔ بظاہر یہ کام ظلم تھا لیکن حضرت خضرؑ نے وضاحت کی کہ ایک بادشاہ صحیح سالم کشتیوں کو غصب کرتا آ رہا تھا۔ اگر یہ کشتی سالم ہوتی تو بادشاہ چھین لیتا۔ گویا ایک تختہ ضائع ہو گیا لیکن پوری کشتی بچ گئی۔ اِس کے بعد ایک بچے کو حضرت خضرؑ نے قتل کر دیا۔ بظاہر یہ قتلِ ناحق تھا لیکن حضرت خضرؑ نے بتایا کے اِس بچے نے بڑے ہو کر اپنے والدین کے لئے وبالِ جان بننا تھا۔ وہ اپنا بھی نامہ ٔ اعمال سیاہ کرتا اور والدین کو بھی پریشان کرتا۔ اللہ تعالیٰ والدین کو اِس سے بہتر بچہ عطا فرمائے گا۔ اِس کے بعد حضرت خضرؑ اور حضرت موسیٰؑ ایک بستی میں پہنچے۔ بستی والوں نے اِن مسافروں کو کھانا کھلانے سے انکار کر دیا۔ حضرت خضرؑ نے بستی میں ایک ایسی دیوار تعمیر کر دی جو بالکل گرنے والی تھی۔ حضرت موسیٰؑ نے اعتراض کیا کہ آپ نے بغیر معاوضے کے بخیل بستی والوں کا یہ کام کر دیا۔ حضرت خضرؑ نے وضاحت کی کہ اِس دیوار کے نیچے دو یتیم بچوں کی وراثت ایک خزانہ کی صورت میں دفن ہے۔ اگر دیوار گر جاتی تو وہ خزانہ بخیل بستی والوں کے ہاتھ میں آ جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے یہ دیوار تعمیر کرا دی تا کہ حق داروں کو اُن کا حق مل جائے۔ آخر میں حضرت خضرؑ نے فرمایا کہ میں نے سب کچھ اللہ کے حکم سے کیا اور یہ سب اللہ کی رحمت کے مظاہر ہیں۔

4 - اِس دنیا کی ہر راحت یا تکلیف عارضی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ۭ وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿ (النحل: 96)

''جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جاتا ہے اور جو اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے (یعنی کبھی ختم نہیں ہوگا) اور جن لوگوں نے صبر کیا ہم اُن کو اُن کے اعمال کا نہایت اچھا

بدلہ دیں گے۔''

اگر کوئی شے ہم سے چھن گئی ہے تو اُس نے ایک روز فنا ہونا ہی تھا۔ دنیوی زندگی تو ہے ہی بڑی محدود۔ اصل زندگی تو ہے ہی آخرت کی۔ انسان کی تمنا یہ ہونی چاہیئے کہ اے اللہ ہمیں آخرت کی نعمتیں عطا فرما۔ ہمیں اپنے مرنے والے عزیزوں کا جنت میں ساتھ عطا فرما۔ جنت کا ساتھ کبھی ختم ہونے والا نہیں اور دنیا کا ساتھ تو لازمی ختم ہوگا۔ آج اگر ہمارے کسی عزیز کا انتقال ہوا ہے تو اُس نے ایک روز مرنا ہی تھا اور ہمیں بھی کسی روز یہاں سے رخصت ہونا ہی ہے۔ اِسی لئے مصیبت پر یہ کلمات پڑھنا مسنون ہے کہ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (ہم اللہ ہی کے ہیں اور ہمیں اُسی کی طرف لوٹ جانا ہے)۔ ایک بادشاہ نے شاندار محل بنوایا اور ایک درویش کو اُس محل کے نظارہ کی دعوت دی۔ درویش نے تبصرہ کیا کہ اگر کسی طرح دو باتوں کا ازالہ ہو جائے تو پھر یہ محل بہت ہی عمدہ ہے۔ پہلی یہ کہ محل کے بارے میں ضمانت مل جائے کہ یہ ہمیشہ رہے گا۔ دوسرے یہ کہ بادشاہ سلامت بھی ہمیشہ اِس محل میں رہ سکیں گے۔ اصل حقیقت تو یہ ہے کہ محل یہیں رہے گا اور بادشاہ سلامت دنیا سے چلے جائیں گے اور یا بادشاہ سلامت کے سامنے کوئی آفت اِس محل کو برباد کر دے گی۔

5 - اللہ نے دنیوی زندگی ہمیں عطا ہی اِس لئے کی ہے کہ وہ ہمارا امتحان لے :

خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ﴿ (الملک : 2)

''اُس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تا کہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں سے کون عمل کے اعتبار سے بہتر ہے۔''

قلزمِ ہستی سے تو اُبھرا ہے مانندِ حباب
اِس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

اِس دنیا میں انسان پر جو اچھے یا برے حالات آتے ہیں وہ درحقیقت اللہ کی طرف سے ایک امتحان و آزمائش کا ذریعہ ہیں :

وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً وَاِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿﴾

''اور ہم تمہیں آزماتے ہیں شر اور خیر سے جو آزمائش کی صورتیں ہیں اور تم ہماری ہی طرف لوٹ کر آؤ گے۔'' (الانبیاء : 35)

اِس حقیقت کو بڑے مؤثر اسلوب میں بیان کیا گیا سورۂ فجر کی آیات 15 اور 16 میں :

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ﴿﴾ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ ﴿﴾

''پس انسان (کا معاملہ عجیب ہے کہ) جب اُس کا پروردگار اُس کو آزماتا ہے تو اُسے عزت دیتا اور نعمت بخشتا ہے تو کہتا ہے کہ میرے پروردگار نے مجھے عزت بخشی اور جب (دوسری طرح) آزماتا ہے کہ اُس پر روزی تنگ کر دیتا ہے تو کہتا ہے کہ میرے پروردگار نے مجھے ذلیل کیا۔''

دنیوی زندگی میں خوشحالی نہ عزت کی علامت ہے اور نہ ہی تنگدستی ذلت کا مظہر۔ یہ دونوں صورتیں امتحان اور آزمائش کی ہیں۔ اللہ ہر پہلو سے جانچتا ہے۔ کبھی وہ دے کر آزماتا ہے اور کبھی چھین کر۔ ایک شکر کا امتحان ہے اور دوسرا صبر کا۔ کبھی اللہ تعالیٰ نعمتیں دیتا ہے یہ دیکھنے کے لئے کہ بندہ شکر کرتا ہے یا نہیں۔ کہیں عیش میں اللہ کو بھول تو نہیں جاتا :

ظفر آدمی اُس کو نہ جانیے گا، وہ ہو کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی، جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

کبھی اللہ تعالیٰ تکلیف دیتا ہے یہ جانچنے کے لئے کہ بندہ صبر کرتا ہے یا نہیں۔ قرآنِ حکیم میں بار بار نیک بندوں کی صفات آئی ہیں صبار اور شکور۔ نعمتوں کے ملنے پر ہمیں شکر کرنا چاہیئے اور تکلیف آنے پر صبر۔ مصائب پر شور و واویلا کرنے، مرثیہ پڑھنے اور اللہ سے شکوہ یا شکایت کرنے سے مرنے والے واپس نہیں آتے اور نقصانات کی تلافی نہیں ہوتی لیکن ہم اجر سے محروم ہو جاتے ہیں۔ بعض خواتین غم کے موقع پر اِس انداز سے مرنے والے کی

باتیں یا دلاتیں ہیں یا نوحہ پڑھتی ہیں کہ اِس سے صدمہ میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ عمل اللہ کو پسند نہیں کیونکہ ایسا کرنا اللہ کے فیصلہ پر عدم اطمینان کا اظہار ہے۔ اِس حوالے سے احادیثِ مبارکہ ہیں :

اِنّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ بَرِءَ مِنَ الصَّالِقَةِ وَالْحَالِقَةِ وَالشَّاقَّةِ.

''بے شک اللہ کے رسول ﷺ اُس عورت سے بیزار ہیں جو نوحہ کرنے والی (مصیبت کی وجہ سے)، سر منڈانے والی اور گریبان چاک کرنے والی ہو۔'' (بخاری و مسلم)

اَلنَّائِحَةُ اِذَا لَمْ تَتُبْ قَبْلَ مَوْتِهَا، تُقَامُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَعَلَيْهَا سِرْبَالٌ مِّنْ قَطِرَانٍ، وَدِرْعٌ مِّنْ جَرَبٍ

''بین کرنے والی عورت، اگر مرنے سے پہلے توبہ نہ کرے تو اُسے قیامت کے دن اِس طرح کھڑا کیا جائے گا کہ اُس پر تارکول کا کرتہ اور خارش کی زرہ ہوگی۔'' (مسلم)

اِثْنَتَانِ فِي النَّاسِ هُمَا بِهِمْ كُفْرٌ: اَلطَّعْنُ فِي النَّسَبِ وَالنِّيَاحَةُ عَلَى الْمَيِّتِ

''دو چیزیں لوگوں میں ایسی ہیں، جو اُن کے حق میں کفر ہیں۔ نسب میں طعنہ زنی کرنا اور میت پر بین کرنا۔'' (مسلم)

لَيْسَ مِنّا مَنْ ضَرَبَ الْخُدُوْدَ وَ شَقَّ الْجُيُوْبَ وَ دَعَا بِدَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ

''وہ شخص ہم میں سے نہیں، جس نے رخساروں کو پیٹا اور گریبانوں کو چاک کیا اور جاہلیت کے بول بولے (یعنی بین کیا)۔'' (بخاری و مسلم)

عَنْ اُمِّ عَطِيَّةَ رضی اللہ عنہا قَالَتْ اَخَذَ عَلَيْنَا النَّبِيُّ ﷺ عِنْدَ الْبَيْعَةِ اَنْ لَّا نَنُوْحَ

حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ ''رسول اللہ ﷺ نے بیعت کے وقت ہم سے یہ عہد لیا کہ ہم بین نہیں کریں گی۔'' (بخاری و مسلم)

وَعَنْ اُسِيْدُ بْنُ اَبِيْ اَسِيْدٍ عَنِ امْرَاَةٍ مِنَ الْمُبَايِعَاتِ قَالَتْ: كَانَ فِيْمَا اَخَذَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِي الْمَعْرُوْفِ الَّذِيْ اَخَذَ عَلَيْنَا اَنْ لَّا نَعْصِيَهٗ فِيْهِ اَنْ

لَّا نَخْمِشَ وَجْهاً وَّلَا نَدْعُوَ وَيْلاً وَّلَا نَشُقَّ جَيْباً وَّلَا نَنْشُرَ شَعْراً (ابوداؤد)

''حضرت اُسید بن ابی اَسید اُس عورت سے روایت کرتے ہیں جو رسول اللہؐ سے بیعت کرنے والوں میں سے تھی۔ اُس نے بیان کیا، وہ بھلائی کے کام، جن کے کرنے کا اللہ کے رسول ﷺ نے ہم سے عہد لیا تھا، اُن میں یہ عہد بھی تھا کہ ہم اللہ کی نافرمانی نہ کریں، چہرہ نہ نوچیں، ہلاکت کی بددعا نہ کریں، گریبان چاک نہ کریں اور بال نہ بکھیریں۔''

پھر اصل صبر وہ ہے جو فوری طور پر کیا جائے، ورنہ شکوے شکایات کرنے کے بعد صبر تو کرنا ہی پڑتا ہے اور اُس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ بخاری اور مسلم میں یہ واقعہ بیان ہوا :

مَرَّ النَّبِیُّ ﷺ عَلٰی اِمْرَاَۃٍ تَبْکِیْ عِنْدَ قَبْرٍ فَقَالَ اتَّقِی اللّٰہَ وَاصْبِرِیْ فَقَالَتْ اِلَیْکَ عَنِّی فَاِنَّکَ لَمْ تُصَبْ بِمُصِیْبَتِی وَلَمْ تَعْرِفْہُ فَقِیْلَ لَھَا اِنَّہُ النَّبِیُّ ﷺ فَاَتَتْ بَابَ النَّبِیِّ ﷺ فَلَمْ تَجِدْ عِنْدَہُ بَوَّابِیْنَ فَقَالَتْ لَمْ اَعْرِفْکَ فَقَالَ اِنَّمَا الصَّبْرُ عِنْدَ الصَّدْمَۃِ الْاُوْلٰی

''نبی کریم ﷺ ایک عورت کے پاس سے گزرے جو ایک قبر پر بیٹھی رو رہی تھی۔ آپؐ نے اُس سے فرمایا، اللہ سے ڈر اور صبر کر۔ اُس نے کہا مجھ سے دُور ہو جا! تجھے وہ مصیبت نہیں پہنچی جو مجھے پہنچی ہے۔ اُس نے رسول اللہ ﷺ کو نہیں پہچانا (اِس لئے فرطِ غم میں اُس نے نازیبا انداز اختیار کیا)۔ بعد میں اُسے بتلایا گیا کہ وہ تو نبی ﷺ تھے۔ چنانچہ (یہ سن کر) وہ آپؐ کے دروازے پر آئی، وہاں دربانوں کو نہیں پایا، (آ کر) اُس نے کہا کہ میں نے آپؐ کو نہیں پہچانا۔ آپؐ نے اُسے (پھر وعظ کرتے ہوئے) فرمایا، صبر تو یہی ہے کہ صدمے کے آغاز میں کیا جائے (بعد میں تو صبر آ ہی جاتا ہے)۔''

6 - آخرت میں جواب دہی کے حوالے سے صبر کا امتحان شکر کے امتحان کے مقابلہ میں آسان ہے۔ وہ آزمائش نسبتاً آسان ہے جس میں اللہ نے کچھ چھین کر آزمایا ہو بجائے اِس کے کہ اللہ نے کچھ دے کر امتحان لیا ہو۔ روزِ قیامت ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ یَوْمَئِذٍ عَنِ

النَّعِیْمِ کے مطابق ایک ایک نعمت کے حوالے سے جوابدہی کرنی ہوگی۔ زندگی، مال اور اولاد کے حوالے سے باز پرس ہوگی۔ اِس دنیا میں اِن نعمتوں کی جتنی فروانی ہوگی اتنا ہی حساب دینا یعنی Account for کرنا بھاری ہو جائے گا۔ اِس کے برعکس اگر انسان کے پاس دنیوی نعمتیں کم ہیں تو انسان کے لئے جوابدہی کا مرحلہ آسان ہو جائے گا۔ نبی اکرم ﷺ کے ارشادات ہیں :

اِطَّلَعْتُ فِی الْجَنَّۃِ فَرَاَیْتُ اَکْثَرَ اَھْلِھَا الْفُقَرَاءَ وَاطَّلَعْتُ فِی النَّارِ فَرَاَیْتُ اَکْثَرَ اَھْلِھَا النِّسَاءَ

''میں نے جنت میں دیکھا تو اُس میں اکثر تعداد فقراء کی تھی اور جہنم میں دیکھا تو اُس میں اکثر تعداد عورتوں کی تھی۔'' (بخاری، مسلم)

یَدْخُلُ الْفُقَرَاءُ الْجَنَّۃَ قَبْلَ الاَغْنِیَاءِ بِخَمْسِ مِائَۃِ عَامٍ

''فقراء جنت میں مالداروں سے پانچ سو برس قبل داخل ہوں گے۔'' (ترمذی)

یَوَدُّ اَھْلُ الْعَافِیَۃِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ حِیْنَ یُعْطٰی اَھْلُ الْبَلاَءِ الثَّوَابَ لَوْ اَنَّ جُلُوْدَھُمْ کَانَتْ قُرِضَتْ فِی الدُّنْیَا بِالْمَقَارِیْضِ

''قیامت کے دن جب اُن بندوں کو جو دنیا میں مبتلائے مصائب رہے، اِن مصائب کے عوض اجر و ثواب دیا جائے گا تو وہ لوگ جو دنیا میں ہمیشہ آرام اور چین سے رہے، حسرت کریں گے کہ کاش دنیا میں ہماری کھالیں قینچیوں سے کاٹی گئی ہوتیں''۔ (ترمذی)

صبر کی آزمائش کے نسبتاً آسان ہونے کے حوالے سے امام احمد بن حنبلؒ کا واقعہ ہے کہ جب خلق قرآن کے مسئلہ میں اُن پر تشدد ہو رہا تھا اور پیٹھ پر کوڑے برس رہے تھے، ایسے کوڑے کہ اگر ہاتھی کو مارے جاتے تو وہ بھی بلبلا اٹھتا، لیکن آپ نے اِس پر نہ اُف کی اور نہ آنسو بہائے۔ پھر وہ وقت آیا کہ نئے خلیفہ نے تلافی کے لئے آپ کے گھر پر اشرفیوں کا بھرا ہوا تھیلا بھیجا تو آپ رونے لگے اور فرمایا اے اللہ! میں اس آزمائش کا اہل نہیں ہوں،

یہ زیادہ بڑی آزمائش ہے، اِس میں کامیاب ہونا زیادہ مشکل ہے۔

البتہ اِس کا ہرگز یہ مفہوم نہیں ہے کہ ہم دعا کریں کہ اے اللہ ہمیں بھی صبر کے امتحان میں ڈال دے۔ ایسی آرزو کرنا اپنے آپ کو بہادر ظاہر کرنے کے مترادف ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی مشکل آجائے اور ہم صبر نہ کرسکیں۔ اللہ سے ہمیشہ عافیت ہی مانگنی چاہیئے۔ البتہ اگر کوئی تکلیف آہی جائے، کوئی صدمہ پہنچ ہی جائے یا کوئی نقصان ہوہی جائے تو آدمی اُس پر یہ سوچ کر صبر کرلے کہ اِس امتحان کا اجر اللہ کے ہاں زیادہ ہے، اگر میں اِس پر صبر کرلوں اور اللہ سے کوئی شکوہ وشکایت نہ کروں۔ مسند احمد میں روایت ہے :

قَالَ عَلِیٌّ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْاَلُکَ الصَّبْرَ فَقَالَ ﷺ لَقَدْ سَئَلْتَ اللّٰہَ الْبَلاَءَ فَسَلْہُ الْعَافِیَۃَ

''حضرت علیؓ فرماتے ہیں کی میں نے دعا کی کہ اے اللہ! مجھے صبر دے۔ آپؐ نے فرمایا کہ تم نے اللہ سے آزمائش مانگی ہے۔ پس اللہ سے عافیت کا سوال کرو۔''

مسنون دعا ہے :

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ الْعَفْوَ وَالْعَافِیَۃَ وَالْمُعَافَاۃَ وَحُسْنَ الْیَقِیْنِ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ (نسائی)

''اے اللہ! میں آپ سے دنیا اور آخرت کے لئے سوال کرتا ہوں بخشش، تندرستی، لوگوں کے شرور سے حفاظت اور عمدہ یقین کا۔''

- لِکَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ (تاکہ تم افسوس نہ کرو اُس پر جو شے تمہارے ہاتھ سے جاتی رہے) کے الفاظ رہنمائی دے رہے ہیں کہ مذکورہ بالا حقائق کا ادراک ہو تو انسان کسی عزیز کے انتقال، کسی مالی نقصان اور کسی موقع کے ہاتھ سے نکل جانے کا ایسا تأثر نہیں لیتا کہ اپنے بال نوچے، گریبان پھاڑے، سر دیوار سے ٹکرائے، سر پر خاک ڈالے، نوحے یا مرثیے پڑھے، اللہ سے شکوے کرے یا زمانے کو موردِ الزام ٹھہرائے کہ :

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

مذکورہ بالا حقائق کا شعور بندۂ مومن میں تسلیم ورضا کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ اِس کے برعکس ایک عام انسان کی نگاہ صرف اسباب پر ہوتی ہے اور وہ اچھے یا برے حالات کا بہت زیادہ تأثر لیتا ہے :

وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَی الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰبِجَانِبِہٖ ۚ وَاِذَا مَسَّہُ الشَّرُّ کَانَ یَؤُسًا ﴿﴾ (بنی اسرائیل : 83)

''اور جب ہم انسان کو نعمت بخشتے ہیں تو اعراض کرتا ہے اور پہلو پھیر لیتا ہے اور جب اُسے سختی پہنچتی ہے تو ناامید ہوجاتا ہے۔''

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ ھَلُوْعًا ﴿﴾ اِذَا مَسَّہُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ﴿﴾ وَاِذَا مَسَّہُ الْخَیْرُ مَنُوْعًا ﴿﴾ (المعارج:19-21)

''کچھ شک نہیں کہ انسان کم حوصلہ پیدا ہوا ہے۔ جب اُسے تکلیف پہنچتی ہے تو گھبرا اٹھتا ہے اور جب آسائش حاصل ہوتی ہے تو بخیل بن جاتا ہے۔''

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے :

اَحْرِصْ عَلٰی مَا یَنْفَعُکَ وَاسْتَعِنْ بِاللّٰہِ وَلاَ تَعْجَزْ فَاِنْ اَصَابَکَ شَیْءٌ فَلاَ تَقُلْ : لَوْ اِنِّیْ فَعَلْتُ کَذَا وَکَذَا وَلٰکِنْ قُلْ : قَدَّرَ اللّٰہُ وَمَا شَاءَ فَعَلَ فَاِنَّ لَوْ تَفْتَحُ عَمَلَ الشَّیْطَانِ

''اُس شے کی حرص کرو جو تمہیں فائدہ دے اور اللہ سے مدد طلب کرو اور ہمت نہ ہارو اور اگر تمہیں کچھ (نقصان) پہنچ جائے تو یہ مت کہو کہ اگر میں ایسا کرلیتا تو ایسا ہوجاتا۔ البتہ یہ کہو کہ اللہ کی تقدیر یہی تھی اور جو اُس نے چاہا، کردیا کیوں کہ 'اگر' کا لفظ (کلمۂ لو) شیطان کے کام کا دروازہ کھول دیتا ہے۔'' (مسلم)

رضائے حق پہ راضی رہ یہ حرفِ آرزو کیسا
خدا خالق ، خدا مالک ، خدا کا حکم تو کیسا

تسلیم و رضا کی کیفیت کا مولانا محمد علی جوہرؒ کے اِن اشعار میں کیا خوب اظہار ہے جو اُنہوں نے اپنی بیٹی کے نام جیل سے لکھے تھے، جب وہ ٹی بی کے مرض میں مبتلا تھی :

میں ہوں مجبور پر اللہ تو مجبور نہیں
تجھ سے میں دور سہی وہ تو مگر دور نہیں
امتحاں سخت سہی پر دلِ مومن ہی وہ کیا
جو ہر اِک حال میں امید سے مامور نہیں
تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اُس کو
نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

- اللہ اور تقدیر پر ایمان انسان کو داخلی امن و سکون دیتا ہے کیونکہ ایمان کے معنی ہیں امن دینا۔ بندۂ مومن کبھی بھی غم کو گلے کا ہار نہیں بناتا اور نہ ہی اُس کی طبیعت اِس طرح بجھ کر رہ جاتی ہے کہ وہ مستقل مایوسی (**Depression**) کا شکار ہو جائے اور اُس کی کمرِ ہمت ٹوٹ کر رہ جائے۔
- اِن آیات میں کسی صدمہ پر فوری اور غیر اختیاری تأثر کی نفی نہیں بلکہ اُس مستقل تأثر کی نفی ہے جس سے زبان پر شکوہ اور دل میں رب سے بدگمانی کا شائبہ پیدا ہوتا ہے۔ اگر وقتی طور پر انسان مغموم ہو اور آنکھوں سے آنسو بہہ جائیں تو یہ کیفیات ایمان کے منافی نہیں ہیں۔ بخاری و مسلم میں یہ واقعہ بیان ہوا ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ کے نواسے یعنی حضرت زینبؓ کے صاحب زادے پر نزع کا وقت قریب آیا تو اُنہوں نے آپ ﷺ سے تشریف لانے کی درخواست کی۔ آپ ﷺ نے پیغام بھیجا :

اِنَّ لِلّٰهِ مَااَخَذَ وَلَهُ مَااَعْطٰى وَكُلٌّ عِنْدَهُ بِاَجَلٍ مُسَمًّى فَلْتَصْبِرْ وَلْتَحْتَسِبْ

''اللہ تعالیٰ کسی سے جو کچھ لے وہ بھی اُسی کا ہے، اور کسی کو جو کچھ دے وہ بھی اُسی کا ہے، الغرض ہر چیز ہر حال میں اُسی کی ہے (اگر کسی کو دیتا ہے تو اپنی چیز دیتا ہے اور کسی سے لیتا ہے تو اپنی چیز لیتا ہے) اور ہر چیز کے لئے اُس کی طرف سے ایک مدت اور وقت مقرر ہے (اور اُس وقت کے آجانے پر وہ چیز اِس دنیا سے اٹھالی جاتی ہے) پس چاہیئے کہ تم صبر کرو اور اللہ تعالیٰ سے اِس صدمہ کے اجر و ثواب کی طالب بنو۔''

حضرت زینبؓ نے قسم دے کر آپ ﷺ سے درخواست کی کہ آپ ﷺ ضرور تشریف لائیں۔ آپ ﷺ چند صحابہؓ کے ساتھ اپنی صاحبزادی کے ہاں پہنچے۔ بچہ اٹھا کر آپ کی گود میں دیا گیا۔ اُس کا سانس اُکھڑ رہا تھا۔ اِس حال میں بچے کو دیکھ کر آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اِس پر حضرت سعد بن عبادہؓ نے حیرت سے عرض کیا : یہ کیا؟ آپ ﷺ نے فرمایا :

هٰذِهٖ رَحْمَةٌ جَعَلَهَا اللّٰهُ فِى قُلُوْبِ عِبَادِهٖ فَاِنَّمَا يَرْحَمُ اللّٰهُ مِنْ عِبَادِهِ الرُّحَمَاءُ

''یہ رحمت کے اُس جذبہ کا اثر ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دلوں میں رکھ دیا ہے اور اللہ کی رحمت اُن ہی بندوں پر ہوگی جن کے دلوں میں رحمت کا یہ جذبہ ہو (اور جن کے دل سخت اور رحمت کے جذبہ سے بالکل خالی ہوں، وہ خدا کی رحمت کے مستحق نہ ہوں گے)۔''

اِسی طرح جب آپ ﷺ کے صاحبزادے سیدنا ابراہیم (علیہ وعلی ابیہ السلام) پر نزع کا عالم طاری ہوا تو اُن کو دیکھ کر آپ ﷺ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے عرض کیا : آپ ﷺ کی یہ کیفیت؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا :

اِنَّ الْعَيْنَ تَدْمَعُ وَالْقَلْبَ يَحْزَنُ وَلَا نَقُوْلُ اِلَّا مَا يَرْضٰى رَبُّنَا وَاِنَّا بِفِرَاقِكَ يَا اِبْرَاهِيْمُ لَمَحْزُوْنُوْنَ (بخاری)

''آنکھ آنسو بہاتی ہے دل مغموم ہے اور زبان سے ہم وہی کہیں گے جو اللہ کو پسند ہو (یعنی

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّـآ اِلَيۡهِ رٰجِعُوۡنَ)اوراے ابراہیم تمہاری جدائی کا ہمیں صدمہ ہے۔''

- وَلَا تَفۡرَحُوۡا بِمَا اٰتٰكُمۡ (اور نہ اتراؤ اُس پر جو تم کو وہ (اللہ) عطا کرے) کے الفاظ سے مراد یہ ہے کہ کسی نعمت کے ملنے پر خوشی و مسرت کا اظہار کرنا ایک فطری عمل ہے اور یہ ایمان کے منافی نہیں ہے۔البتہ ایسے موقع پر خوشی کی وجہ سے پھولے نہ سمانا اور اترانا ایمان کے منافی ہے۔اِس کی وجہ یہ ہے کہ انسان حصولِ نعمت کو اپنی صلاحیت اور کاوشوں کا نتیجہ سمجھتا ہے لہٰذا اُس میں خود پسندی اور اپنی بڑائیاں کرنے کی برائی پیدا ہو جاتی ہے۔ اِسی لئے فرمایا وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخۡتَالٍ فَخُوۡرٍ (اور اللہ پسند نہیں کرتا خود کو کچھ سمجھنے والے اور بڑائی کرنے والے کو)۔

- درحقیقت جتنا انسان ایمان سے دور ہوگا اتنا ہی اِن غم اور خوشی کی کیفیات میں اعتدال سے بڑھتا چلا جائے گا۔ جتنا انسان حقائق سے قریب تر آئے گا، ایمان سے بہرہ ور ہوگا، معرفتِ ربانی سے حصہ پائے گا، اتنا ہی اِن دونوں کیفیات کے مابین فاصلہ کم سے کم تر ہوتا چلا جائے گا۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

مَآ اَصَابَ مِنۡ مُّصِيۡبَةٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰهِ وَمَنۡ يُّؤۡمِنۡۢ بِاللّٰهِ يَهۡدِ قَلۡبَهٗ
وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ ﴿﴾ (التغابن :11)

''کوئی مصیبت نازل نہیں ہوتی مگر اللہ کے حکم سے اور جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہے وہ اُس کے دل کو (تسلیم و رضا کی) ہدایت دیتا ہے اور اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔''

اگر انسان کا دل نورِ ایمان سے منور ہے تو پھر کشادگی ہو یا تنگی، مسرت بخش صورتِ حال ہو یا تکلیف دہ کیفیت، اِن سب کے مابین انسان کی معنوی شخصیت ایک چٹان کے مانند کھڑی ہوگی :

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ

- راضی برضائے رب ہونا بندۂ مومن کی صفت ہے لیکن اِس کا مطلب یہ نہیں کہ ماضی سے سبق حاصل نہ کیا جائے، مجرموں کو سزا نہ دی جائے، ظلم و استحصال کو تقدیر سمجھ کر اُن کے خلاف علمِ جہاد بلند نہ کیا جائے اور ظالموں سے بدلہ نہ لیا جائے۔راضی برضائے رب ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ بندہ اللہ سے کسی قسم کا سوئے ظن نہ رکھے اور اُس کے کسی فیصلہ پر عدم اعتماد اور بے صبری کا مظاہرہ نہ کرے۔

☆ آیت : **24** :

اَلَّذِيۡنَ يَبۡخَلُوۡنَ -- جو بخل کرتے ہیں -- وَيَاۡمُرُوۡنَ النَّاسَ بِالۡبُخۡلِ -- اور لوگوں کو بھی بخل کا مشورہ دیتے ہیں -- وَمَنۡ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡغَنِىُّ الۡحَمِيۡدُ ﴿﴾ اور جس نے رُخ پھیر لیا تو بے شک اللہ کسی کا محتاج نہیں اور بذاتِ خود محمود ہے۔

- اَلَّذِيۡنَ يَبۡخَلُوۡنَ (جو بخل کرتے ہیں) سے مراد وہ لوگ ہیں جو ایمانی حقائق سے دور اور محروم ہیں۔وہ دنیوی زندگی کو ہی اصل زندگی سمجھتے ہیں، یہاں کے برے حالات کا شدید تأثر لیتے ہیں اور یہاں کی نعمتوں کو سمیٹ سمیٹ کر رکھتے ہیں۔سورۂ ھمزۃ میں اِس طرح کے کردار کو یوں بیان کیا گیا :

وَيۡلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ﴿﴾ الَّذِىۡ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ﴿﴾
يَحۡسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخۡلَدَهٗ ﴿﴾ (ھمزۃ :1 - 3)

''خرابی ہے ہر طعنہ دینے اور چغلی کھانے والے کے لئے، جو مال جمع کرتا اور اُسے گن گن کر رکھتا ہے (اور) خیال کرتا ہے کہ اُس کا مال اُسے ہمیشہ زندہ رکھے گا۔''

- سورۂ حدید کی آیت 18 میں ہم سمجھ چکے ہیں کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا انسان کے دل کو ایمان کے نور سے منور کرتا ہے۔اِس کے برعکس مال روک روک کر رکھنا انسان کے دل میں نفاق پیدا کرتا ہے۔منافقین خود تو نیک کاموں سے محروم ہوتے ہیں لیکن ساتھ ہی

ساتھ دوسروں کو بھی نیک کاموں سے منع کرتے ہیں۔ اِسی لئے آیت کے اگلے حصہ میں فرمایا وَیَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ (اور وہ لوگوں کو بھی بخل کا مشورہ دیتے ہیں)۔ جو لوگ پیچھے رہ جاتے ہیں اُنہیں آگے بڑھنے والے کبھی اچھے نہیں لگتے۔ اُن کے آگے بڑھ جانے سے پیچھے رہ جانے والوں کی کمزوری زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ لہٰذا وہ دوسرے ساتھیوں کو بھی دین کے لئے قربانی دینے سے روکتے ہیں تا کہ وہ بھی اِن ہی کی طرح ہو جائیں۔ اگر کوئی اللہ کا بندہ دین کی راہ پر آگے بڑھنا چاہتا ہے اور اُس میں انفاق فی سبیل اللہ کا جذبہ ابھرتا ہے تو منافقین بظاہر بڑے خیر خواہ بن کر ہمدردی کے انداز میں کہتے ہیں، میاں ہوش کے ناخن لو، کہاں جا رہے ہو، کیا کر رہے ہو، کچھ مستقبل کی فکر کرو، کچھ آئندہ کے لئے بچت کے بارے میں سوچو، بڑی بڑی ذمہ داریاں ہیں تم پر۔ بچے ابھی چھوٹے ہیں، کل بڑے ہوں گے، اِن کی ذمہ داریاں تم نے ادا کرنی ہیں۔ زیادہ جذباتی نہ بنو۔ کچھ اپنے خیر و شر اور نفع و نقصان کا خیال کرو۔

- آیت کے آخر میں فرمایا وَمَنْ یَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ (اور جس نے رُخ پھیر لیا تو بے شک اللہ کسی کا محتاج نہیں اور بذاتِ خود محمود ہے)۔ یہ اللہ کی طرف سے بڑا دوٹوک انداز ہے۔ اتنی واضح آیات سامنے آنے کے بعد بھی اگر کوئی شخص دنیوی زندگی اور اِسی کی نعمتوں کو اہمیت دے رہا ہے تو وہ کان کھول کر سن لے کہ اللہ کو کسی کی نیکی، ایثار، قربانی اور انفاق کی کوئی احتیاج نہیں۔ اللہ کا کوئی کام تمہارے جہاد یا انفاق نہ کرنے سے رکا ہوا نہیں۔ حدیثِ قدسی ہے:

یَا عِبَادِیْ لَوْ اَنَّ اَوَّلَکُمْ وَاٰخِرَکُمْ، وَاِنْسَکُمْ وَجِنَّکُمْ. کَانُوْا عَلٰی اَتْقٰی قَلْبِ رَجُلٍ وَّاحِدٍ مِّنْکُمْ. مَا زَادَ ذٰلِکَ فِیْ مُلْکِیْ شَیْئاً. یَا عِبَادِیْ لَوْ اَنَّ اَوَّلَکُمْ وَاٰخِرَکُمْ. وَاِنْسَکُمْ وَجِنَّکُمْ. کَانُوْا عَلٰی اَفْجَرِ قَلْبِ رَجُلٍ وَّاحِدٍ. مَّا نَقَصَ ذٰلِکَ مِنْ مُّلْکِیْ شَیْئاً. یَا عِبَادِیْ لَوْ اَنَّ اَوَّلَکُمْ وَاٰخِرَکُمْ. وَاِنْسَکُمْ

وَجِنَّکُمْ. قَامُوْا فِیْ صَعِیْدٍ وَّاحِدٍ فَسَئَلُوْنِیْ. فَاَعْطَیْتُ کُلَّ اِنْسَانٍ مَسْئَلَتَهٗ. مَا نَقَصَ ذٰلِکَ مِمَّا عِنْدِیْ اِلَّا کَمَا یَنْقُصُ الْمِخْیَطُ اِذَا اُدْخِلَ الْبَحْرَ.

''اے میرے بندو! اِس میں شک نہیں کہ اگر تم سب اولین و آخرین، جن و انس اپنے میں سے سب سے زیادہ متقی آدمی کے موافق اپنے دل بنا لو تو (تم سب کا) یہ تقویٰ میری خدائی میں ذرا اضافہ نہ کر سکے گا۔ اے میرے بندو! اگر تم سب اولین و آخرین، جن و انس میں سے سب سے زیادہ گناہ گار آدمی کے دل کے موافق اپنا دل بنا لو تو (اُن کا) یہ گناہ گار ہونا میری خدائی میں سے ذرا بھی کمی نہیں کر سکتا۔ اے میرے بندو! اگر تم اولین و آخرین، جن و انس سب مل کر ایک میدان میں کھڑے ہو کر مجھ سے سوال کرو اور میں ہر شخص کا سوال پورا کر دوں تو (سب کا سوال پورا کرنے پر) میرے خزانوں میں سے صرف اتنی سی کمی آئے گی جتنا کہ سوئی کو سمندر میں ڈبو کر باہر نکالا جائے۔'' (مسلم)

بلاشبہ انسان اللہ کا ہر گھڑی محتاج ہے۔ یہ اُس کی ضرورت ہے کہ اپنی عاقبت سنوارنے کے لئے لگائے اللہ کی راہ میں مال اور جان لگائے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اِس کی توفیق عطا فرمائے اور ہر قسم کی گمراہی سے محفوظ فرمائے۔ آمین!

منتخب نصاب حصّہ ششم

سورۂ حدید حصّہ ششم : آیت 25

تمام رسولوں کا مشن - نظامِ عدل کا قیام

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۞ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۞

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْہِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِیَعْلَمَ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ وَرُسُلَہٗ بِالْغَیْبِ اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ ۞

یہ سورۂ حدید کی وہ اہم ترین آیت ہے جس میں انقلابی مضمون اپنے عروج پر ہے۔ انقلاب کہتے ہیں کسی معاشرے میں رائج نظام کی تبدیلی کو۔ ظاہر ہے اِس کے لئے رائج الوقت نظام کو پہلے تلپٹ کرنا پڑتا ہے اور پھر اُس کی جگہ نیا نظام آتا ہے۔ انقلاب لانے کے لئے پہلے وعظ، نصیحت، تلقین اور تبلیغ کی جاتی ہے لیکن اِس کے بعد ایک مرحلہ آتا ہے جہاں طاقت استعمال کرنی پڑتی ہے۔ تلقین و تعلیم، وعظ و نصیحت اور دعوت و تبلیغ کے نتیجے میں تمام طبقات سے نیک سرشت لوگ دعوت قبول کر لیتے ہیں۔ البتہ وہ لوگ انقلابی دعوت کی راہ میں رکاوٹ ڈالتے ہیں جن کے رائج الوقت نظام کے ساتھ مفادات وابستہ ہوتے ہیں۔ جیسے ہمارے معاشرے میں جاگیردار کا ایک اپنا مقام ہے۔ وہ پورے علاقے کا مالک اور بادشاہ سمجھا جاتا ہے۔ وہاں

پر بسنے والے لوگ اُس کے کمّی کاری ہیں اور اُس کی رعیت شمار ہوتے ہیں۔ چنانچہ جاگیردار کبھی بھی برداشت نہیں کرے گا کہ جاگیردارانہ نظام ختم ہو جائے۔ وہ مخالفت کرے گا اور پھر اُس کے خلاف طاقت کا استعمال کرنا پڑے گا۔ یہ بات کہنا آسان نہیں ہے۔ جنگ اور خون ریزی کو پسند نہیں کیا جاتا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی بات اور صرف دعوت و تبلیغ کے بیان ہی کو کافی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن سورۂ حدید کی اِس آیت مبارکہ میں اِس تلخ حقیقت کو بالکل کھلے انداز میں بیان کر دیا گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ -- بلاشبہ ہم نے بھیجا اپنے رسولوں کو واضح نشانیوں کے ساتھ -- وَاَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ -- اور ہم نے نازل کیں اُن کے ساتھ کتابیں اور ترازو (نظامِ عدل) -- لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ -- تاکہ لوگ عدل پر قائم ہوں -- وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْہِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ -- اور ہم نے لوہا بھی اُتارا ہے جس میں شدید جنگ کی صلاحیت ہے -- وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ -- اور لوگوں کے لئے دیگر فائدے بھی ہیں -- وَلِیَعْلَمَ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ وَرُسُلَہٗ بِالْغَیْبِ -- تاکہ اللہ ظاہر کر دے کہ کون غیب میں رہتے ہوئے اُس کی اور اُس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے -- اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ ۞ بے شک اللہ بڑا طاقتور اور زبردست ہے۔

مناسب ہوگا کہ اِس آیت میں بیان کیے گئے مضامین پر تفصیلی غور و فکر کیا جائے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ

"بلاشبہ ہم نے بھیجا اپنے رسولوں کو واضح نشانیوں کے ساتھ اور ہم نے نازل کیں اُن کے ساتھ کتابیں اور ترازو۔"

آیت کے اِس حصہ کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اِس آیت کا سورۂ صف کی مرکزی آیت یعنی آیت 9 کے ساتھ تقابلی مطالعہ کریں۔ سورۂ حدید کی اِس آیت میں تمام رسولوں کا مقصدِ بعثت

بیان کیا گیا ہے جبکہ سورہ ٔصف کی آیت 9 میں نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت بیان کیا گیا :

هُوَ الَّذِیٓ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ وَلَوۡ کَرِهَ الۡمُشۡرِکُوۡنَ ﴿﴾

’’وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول ؐ کو کامل ہدایت کے ساتھ اور سچّے دین کے ساتھ تا کہ وہ اُسے غالب کر دیں کل نظامِ زندگی پر اور چاہے مشرکین کو کتنا ہی ناگوار گزرے۔‘‘

مذکورہ بالا دونوں آیات کے تقابلی مطالعہ سے حسبِ ذیل اہم نکات کا فہم حاصل ہوتا ہے :

i- سورہ ٔحدید کی آیت میں الفاظ آئے لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا - بلاشبہ ہم نے بھیجا اپنے رسولوں کو۔ سورہ ٔصف کی آیت میں فرمایا هُوَ الَّذِیٓ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ - وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول ﷺ کو۔ روئے ارضی پر قافلہ ٔانسانیت اور قافلہ ٔنبوت و رسالت نے بیک وقت سفر شروع کیا۔ حضرت آدمؑ پہلے انسان بھی تھے اور پہلے نبیؑ بھی۔ قافلہ ٔانسانیت بھی ارتقائی مراحل طے کرتا رہا اور قافلہ ٔنبوت بھی۔ تمام رسولوں کا مقصدِ بعثت تھا قیامِ عدل۔ یہ مقصد ایک اتمامی اور تکمیلی شان اختیار کر گیا رسالتِ محمدی ﷺ میں جس کا ذکر سورہ ٔصف کی آیت میں ہے۔

ii- سورہ ٔحدید کی آیت میں فرمایا کہ تمام رسول بینات اور کتابیں لے کر آئے۔ کتاب کا لفظ عام فہم اور واضح ہے۔ البتہ بینات کا مفہوم وضاحت طلب ہے۔ بینات جمع ہے بیـنـۃ کی اور بینۃ مؤنث ہے بین کی۔ بین کہتے ہیں ایسی چیز یا دلیل کو جو بالکل واضح ہو۔ یہ لفظ دو اعتبارات سے انبیاء و رسل کے بارے میں آتا ہے۔ ایک تو یہ کہ جو تعلیمات وہ لے کر آتے تھے اور جن باتوں کو ماننے کی وہ دعوت دیتے تھے وہ بالکل واضح اور روشن ہیں۔ دوسرے معجزات جو نبوت و رسالت کا واضح ثبوت ہوتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کے لئے اللہ نے کتاب اور معجزے کو جمع فرما دیا تھا۔ آپ ﷺ کا سب سے بڑا معجزہ قرآن ہی ہے

جس کی نظیر پیش کرنے کا قرآن نے کئی بار چیلنج دیا اور جو قیامت تک کے لئے محفوظ کر دیا گیا ہے۔ اِسی لئے سورہ ٔصف کی آیت میں بینات اور کتابوں کی جگہ الہدیٰ آیا ہے جو قرآنِ حکیم ہی کا ایک صفاتی نام ہے۔

iii- سورہ ٔحدید کی آیت میں فرمایا کہ اللہ نے رسولوں کے ساتھ میزان نازل کیا۔ میزان وزن سے بنا ہے یعنی تولنے والی شے جسے ہم ترازو کہتے ہیں۔ اِس کے دونوں پلڑے برابر ہوتے ہیں، اِن میں توازن ہوتا ہے، اِسی سے مفہوم پیدا ہوا توازن کا۔ سورہ ٔصف کی آیت میں میزان کے مقابل دینِ حق یعنی عادلانہ نظام کی اصطلاح وارد ہوئی ہے۔ گویا میزان وہ نظام فکر و عمل ہے جس میں توازن پایا جائے۔ جس میں ہر ایک کے حقوق و اختیارات کا عدل کے ساتھ تعین ہو جائے۔ انسانی تمدن کے بعض مسائل بہت پیچیدہ ہیں جیسے مرد و عورت، والدین و اولاد، سرمایہ و محنت اور فرد و اجتماعیت کے مابین حقوق اور اختیارات کا معاملہ۔ عادلانہ نظام وہ ہے جو اِن پیچیدہ مسائل کے لئے متوازن رہنمائی فراہم کرے۔ اللہ نے اپنے آخری رسول ﷺ کو وہ نظامِ حق دیا جو زندگی کے جملہ پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے اور جس میں انسانی تمدن کے تمام پیچیدہ مسائل کا متوازن حل موجود ہے۔

لِیَقُوۡمَ النَّاسُ بِالۡقِسۡطِ

’’تا کہ لوگ عدل پر قائم ہوں۔‘‘

- آیت کے اِس حصہ میں اللہ تعالیٰ نے تمام رسولوں کی بعثت کا مقصد بتایا ہے قیامِ عدل۔ اِس کے مقابل سورہ ٔصف کی آیت 9 میں فرمایا لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ - تا کہ رسول ﷺ غالب کر دیں دینِ حق کو کل نظامِ زندگی پر۔ گویا قیامِ عدل کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اللہ کے دین کو غالب کر دیا جائے۔
- سورہ ٔحدید کی آیت کے اِس حصہ سے ہمیں رہنمائی ملتی ہے کہ اِس دنیا میں اعلیٰ ترین مشن

کیا ہوسکتا ہے؟ دنیا میں بھلائی کے کام کئی نوعیت کے ہوسکتے ہیں مثلاً خدمتِ خلق، اصلاحِ معاشرہ، اصلاحِ رسومات، اصلاحِ عقائد، تعلیمی و تدریسی خدمت اور تزکیہ نفس کا کام۔ بلاشبہ اللہ کے رسولوں نے مذکورہ بالا خیر کے کام بھی کیے لیکن اُن کا اصل مشن تھا دنیا میں عدل کا قیام۔ اُنہیں کتاب صرف اِس لئے نہیں دی گئی تھی کہ اُس کی تلاوت کے ذریعہ حصول ثواب یا ایصالِ ثواب کرلیا جائے بلکہ مقصود یہ تھا کہ کتاب کی تعلیمات پر مبنی عادلانہ نظام قائم کیا جائے۔ شریعت کی میزان اللہ نے اِس لئے عطا فرمائی کہ اُسے نصب کیا جائے۔ بہترین نظامِ عدل وقسط اگر کتابوں میں لکھا ہوا ہے تو بے معنی ہے جب تک کہ وہ بالفعل نافذ نہ ہو۔

- قیامِ عدل ہی دینِ اسلام کا ایک امتیازی وصف (**Catch Word**) ہے۔ اِس حوالے سے مندرجہ ذیل نکات قابلِ توجہ ہیں:

i- سورہ آلِ عمران آیت **18** میں بڑے جلالی اسلوب میں قیامِ عدل کو اللہ تعالیٰ کی خصوصی شان قرار دیا گیا:

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۞

''گواہی دیتا ہے اللہ کہ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتے اور صاحبانِ علم، قائم کرنے والا ہے عدل کا، اُس کے سوا کوئی معبود نہیں، زبردست ہے بڑی حکمت والا۔''

ii- قرآنِ حکیم میں تین بار (المائدۃ: **42**، الحجرات: **9**، الممتحنہ: **8**) یہ الفاظ آئے کہ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ - بے شک اللہ محبت کرتا ہے عدل کرنے والوں سے۔

iii- اللہ تعالیٰ کی تین صفات کا تعلق عدل سے ہے یعنی ''العدل''، ''العادل'' اور ''المقسط''۔ ''العدل'' مصدر ہے اور یہ لفظ صفت کے طور پر نہیں آتا لیکن اللہ کا یہ بھی ایک صفاتی نام ہے۔ گویا اللہ سراپا عدل ہے۔

iv- قرآنِ حکیم میں اہلِ ایمان کو عدل کرنے اور اِس کا علمبردار بننے کا حکم دیا گیا:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ (النساء: **58**)

''بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانت حوالے کردو اُس کے جو اِس کا حق دار ہے اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے لگو تو فیصلہ کیا کرو عدل کے ساتھ۔''

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ (النساء: **135**)

''اے ایمان والو! ہوجاؤ عدل پر قائم ہونے والے اور گواہ اللہ کے لئے، خواہ (اِس میں) تمہارا یا تمہارے ماں باپ اور رشتہ داروں کا نقصان ہی ہو۔''

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۖ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (المائدہ: **8**)

''اے ایمان والو! کھڑے ہوجاؤ اللہ کے لئے عدل کی گواہی دینے والے بن کر اور لوگوں کی دشمنی تمہیں اِس بات پر آمادہ نہ کرے کہ عدل چھوڑ دو (بلکہ) عدل کرو کہ یہی پرہیزگاری کی بات ہے۔''

v- سورہ شوریٰ آیت **15** میں نبی اکرم ﷺ سے فرمایا گیا کہ اعلان کردیجئے:

وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمُ

''اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان عدل کروں۔''

vi- اِس دنیا میں عادلانہ نظام کا قیام اعلیٰ ترین خدمتِ خلق ہے۔ ظالمانہ نظام مسلسل مظلوم پیدا کرتا رہتا ہے اور اِس کے تحت سماجی خدمت کے کاموں سے محض چند مظلوموں کی دادرسی ہوتی ہے۔ پائیدار خدمتِ خلق یہ ہے کہ مظلوم پیدا کرنے والے نظام ہی کو جڑ سے اکھاڑ دیا جائے۔

۷ - عادلانہ نظام کا قیام دنیا اورآخرت دونوں اعتبار سے انسانوں کے لئے رحمت ہے۔دنیا میں سکون محسوس ہوتا ہے کہ کوئی ہمارا استحصال نہیں کر رہا اور ہمارے حقوق ہمیں حاصل ہو رہے ہیں۔اِس پرسکون ماحول ہی میں انسان آخرت کی تیاری کے لئے اپنا مقصدِ زندگی یعنی اللہ کی عبادت کے لئے بھی یکسو ہوسکتا ہے۔اِس کے برعکس ظالمانہ نظام سب سے بڑا پردہ بن جاتا ہے خالق ومخلوق کے درمیان اور رکاوٹ بن جاتا ہے آخرت کی تیاری کے لئے ۔اِس نظام میں انسانوں کی ایک عظیم اکثریت حیوانوں کی سطح پر آجاتی ہے۔اُن کی زندگی کا صرف ایک مقصد رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ کسی طرح اپنے لئے دو وقت کی روٹی اور ضروریاتِ زندگی کا سامان پورا کرسکیں۔ اب اُن کے لئے کہاں اِس کا موقع ہے کہ وہ دینی تقاضے ادا کریں،اللہ سے لو لگا کر لذتِ مناجات اور حلاوت دعا کی سعادت حاصل کرکے آخرت کی تیاری کرسکیں۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے بقول، دولت کی غیر منصفانہ تقسیم ایک دودھاری تلوار کی طرح انسانوں کا استحصال کرتی ہے۔اِس سے انسانوں کی دنیا وآخرت دونوں ہی برباد ہوجاتی ہیں۔سرمایہ داروں کا طبقہ مالِ حرام پر عیش تو کرتا ہے لیکن روحانی سکون سے محروم ہوجاتا ہے اور عیش میں یادِ خدا اور فکرِ آخرت سے غافل رہتا ہے۔پھر حدیثِ نبوی ﷺ کے مطابق حرام کمائی سے پلنے والا جسم جہنم ہی میں جانے کا حق دار ہے (مسند احمد)۔دوسری طرف غریب کو ضروریاتِ زندگی کی فکر نہ صرف ہر وقت ستائے رکھتی ہے بلکہ آخرت کی تیاری سے بھی بیگانہ رکھتی ہے اور نوبت یہاں تک پہنچ سکتی ہے کہ حدیثِ نبوی ﷺ اِنَّ الْفَقْرَ یَکَادُ یَکُوْنُ کُفْرًا (بیشک قریب ہے کہ فقر، کفر تک پہنچ جائے۔الجامع الصغیر) کے مصداق انسان کو مایوسی کفر تک لے جاتی ہے۔

لہٰذا ضروری ہے کہ وہ نظامِ عدل قسط قائم کیا جائے جس میں ہر ایک کو اُس کا جائز حق

ملے،کوئی کسی دوسرے کے حق پر وہ دست درازی نہ کرسکے،وسائل اور دولت کی تقسیم منصفانہ ہو،مواقع ہوں تو سب کے لئے یکساں ہوں،تمیزِ بندو آقا ختم ہوجائے،کوئی کسی کے تحت دبا اور کچلا ہوا نہ ہو اور سب انسان واقعی آپس میں بھائی بھائی اور اللہ کے بندے بن جائیں۔

وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ

''اور ہم نے لوہا بھی اُتارا ہے جس میں شدید جنگ کی صلاحیت ہے اور لوگوں کے لئے دیگر فائدے بھی ہیں۔''

- آیت کے اِس حصہ میں لوہے کی افادیت کی طرف رہنمائی کی گئی ہے۔بلاشبہ لوہا کئی مفید اشیاء مثلاً کئی قسم کے آلات،ذرائع آمد و رفت ،برتن،فرنیچر اور دیگر ضروریاتِ زندگی بنانے کے لئے استعمال ہوتا ہے لیکن اِس کی اصل خوبی یہ ہے کہ اِس میں اللہ نے شدید قوتِ حرب وضرب رکھی ہے اور اسلحہ و دیگر عسکری ساز و سامان کی تیاری میں یہ کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔
- آیت کے اِس حصہ میں دراصل اِس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ نظامِ عدل کا قیام پُرامن طریقہ کار سے ممکن نہیں،اِس کے لئے تصادم ناگزیر ہے اور لوہے کی عسکری خوبی کو بروئے کار لاتے ہوئے طاقت کا استعمال لازماً کرنا پڑے گا۔اِس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی ظالمانہ اور استحصالی نظام ازخود جڑیں نہیں چھوڑا کرتا۔اِس نظام سے بااختیار طبقہ کے کچھ مفادات اور چودھراہٹیں وابستہ ہوتی ہیں۔یہ طبقہ دوسروں کے حقوق غصب کرکے عیاشی کررہا ہوتا ہے۔یہ طبقہ آسانی سے اپنے مفادات دستبردار نہیں ہوتا۔جب بھی کوئی تحریک اِس طبقہ کے ظلم کو ختم کرنے کے لئے اُٹھتی ہے تو یہ طبقہ اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر اِس تحریک کو کچلنے کے لئے پوری قوت صرف کرتا ہے اور یوں مسلح تصادم کا مرحلہ آکر رہتا ہے۔

- مسلح تصادم کی نوبت انقلابی عمل کے دوران آخری مرحلہ کے طور پر آتی ہے۔ پہلے دعوت دی جاتی ہے اور بات سمجھانے کا حق ادا کیا جاتا ہے۔ اِس دوران مخالفت کے جواب میں کسی ردِعمل کا مظاہرہ نہ کر کے یعنی **Passive Resistance** کے ذریعہ مخالفین پر ایک اخلاقی اثر بھی ڈالا جاتا ہے۔ اب جن لوگوں کے دل میں واقعی خیر ہوتا ہے وہ وعظ و نصیحت اور انقلابی جماعت کے اخلاقی طرزِ عمل سے متأثر ہو کر انقلابی دعوت قبول کر لیتے ہیں۔ البتہ جو لوگ ابوجہل کی طرح لاتوں کے بھوت ہوتے ہیں، اُن کے ساتھ مسلح تصادم کا مرحلہ آتا ہے اور اُن کے خلاف خلاف لوہے کی طاقت استعمال کی جاتی ہے تا کہ قیامِ عدل کا مشن پورا کیا جا سکے۔
- اگر مقصد صرف افراد کی اصلاح اور اُن کا تزکیۂ نفس ہو تو پھر درس گاہیں اور خانقاہیں بنا کر بھی مقصد پورا کیا جا سکتا ہے۔ مخالفت اِس کام میں بھی ہو سکتی ہے لیکن اِسے جھیل کر کام جاری رکھا جا سکتا ہے اور کسی خون ریزی کی نوبت نہیں آتی۔ البتہ اگر پیشِ نظر وہ کام ہے جس کے لئے اللہ نے رسولوں کو بھیجا، یعنی ظالمانہ نظام کو ملیامیٹ کر کے عادلانہ نظام قائم کرنا ہو تو پھر میدان میں آنا پڑے گا، باطل سے پنجہ آزمائی کرنی پڑے گی اور جان کی بازیاں لگانی پڑیں گی۔ نظام کی تبدیلی مسلح تصادم کے بغیر ممکن نہیں۔ اِسی لئے اللہ نے قرآنِ حکیم میں اپنے محبوب بندوں کی صفات بیان کرتے ہوئے خاص طور پر اُن کی اللہ کی راہ میں لڑنے کی شان کو نمایاں کیا :

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ﴿﴾ (الصّف : 4)

''بلاشبہ اللہ تو محبت کرتا ہے اُن سے جو جنگ کرتے ہیں اُس کی راہ میں جم کر صف در صف گویا کہ وہ ہیں سیسہ پلائی ہوئی دیوار۔''

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ﴿﴾

''اور کتنے ہی نبی ایسے گزرے ہیں کہ جن کے ساتھ مل کر بہت سے اللہ والوں نے جنگ کی تو اُنہوں نے ہمت نہ ہاری اُن تکالیف پر جو اُنہیں اللہ کی راہ میں پیش آئیں، نہ وہ کمزور پڑے اور نہ باطل کے سامنے دبے اور اللہ ایسے ہی صبر کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔'' (آلِ عمران : 146)

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۡ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴿﴾ (الاحزاب : 23)

''مومنوں میں وہ جواں مرد بھی ہیں جنہوں نے سچ کر دکھایا وہ عہد جو اُنہوں نے اللہ سے کیا تھا تو اُن میں کچھ ایسے ہیں جو اپنی نذر (جان) پیش کر چکے اور کچھ ایسے ہیں کہ انتظار کر رہے ہیں اور اُنہوں نے (اپنے عہد کی بات کو) ذرا بھی نہیں بدلا۔''

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ

''بے شک اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کی جانیں اور مال خرید لئے ہیں جنت کے عوض وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں، قتل کرتے ہیں (کافروں کو) اور قتل کئے جاتے ہیں۔''

نبی اکرم ﷺ نے جھنجھوڑنے کے انداز میں فرمایا :

''مَنْ مَّاتَ وَ لَمْ يَغْزُ ، وَلَمْ يُحَدِّثْ بِهٖ نَفْسَهٗ ، مَاتَ عَلٰى شُعْبَةٍ مِّن نِّفَاقٍ''

''جس کی موت اِس حال میں واقع ہوئی کہ نہ اُس نے کبھی (اللہ کی راہ میں) جنگ کی اور نہ ہی اُس کے دل میں اِس کی آرزو پیدا ہوئی تو اُس کی موت ایک طرح کے نفاق پر واقع ہوئی۔'' (مسلم)

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیریؓ
کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری

- آیت کے اِس حصہ سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ نظام کی تبدیلی کسی پُرامن طریقہ ٔ کار سے ممکن نہیں۔ایک رائے یہ پیش کی جاتی ہے کہ ہم محض تبلیغ کے ذریعہ ہی خاموش انقلاب برپا کر سکتے ہیں۔اِسی طرح یہ بھی تصور ہے کہ انتخابی یاست میں حصہ لے کر بھی انقلاب لایا جاسکتا ہے۔تجربات شاہد ہیں کہ استحصال اور جبر کرنے والے طبقات کبھی بھی پُرامن طور پر اپنے مفادات چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتے۔یہی وجہ ہے کہ تاریخِ انسانی میں آج تک کوئی انقلاب بغیر مسلح تصادم کے نہیں آیا۔اگر ایسا ممکن ہوتا تو رحمۃ العالمین جنابِ نبی کریم ﷺ تلوار تو کجا ایک چھڑی تک اپنے ہاتھ میں نہ لیتے اور صرف اپنی مؤثر تبلیغ کے ذریعہ ہی حق کو غالب فرما دیتے،لیکن آپ ﷺ کو بھی غلبۂ دین کے لئے تلوار اٹھانا پڑی اور اپنے انتہائی محبوب اور تربیت یافتہ ساتھیوں کی جانوں کا نذرانہ پیش کرنا پڑا۔
- آیت کا یہ حصہ اُس مغالطہ کا بھی ازالہ کرتا ہے جو مستشرقین کو نبی اکرم ﷺ کی سیرت کے حوالے سے محسوس ہوتا ہے۔اُنہیں آپ ﷺ کی مکی زندگی تو نبوی نظر آتی ہے لیکن مدنی زندگی میں آپ ﷺ کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر انتشارِ ذہنی کا شکار ہو جاتے ہیں۔سن 6 ہجری ی میں بظاہر دب کر صلح حدیبیہ کرتے ہوئے وہ آپ ﷺ کو نبوی رنگ میں دیکھتے ہیں لیکن سن 8 ہجری میں ابوسفیان کی عاجزانہ درخواست کے باوجود آپ ﷺ کی طرف سے صلح کی تجدید نہ کرنا اُنہیں سمجھ نہیں آتا۔حالانکہ بات واضح ہے کہ آپ ﷺ کا مقصد تھا عادلانہ نظام کا قیام۔اِس مقصد کے حصول کے لئے جس وقت جو طرزِ عمل مفید تھا آپ ﷺ نے اُسی کو اختیار فرمایا۔اِس مقصد کے لئے ابتداء میں دعوت وتبلیغ کی جاتی ہے اور برائی کا جواب اچھائی سے دیا جاتا ہے :

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ کَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ﴿﴾

''جواب دو (بدی کا) اُس طور پر جو بہت اچھا ہو۔ تو وہ کہ جس کے اور تمہارے درمیان دشمنی ہے ایسے ہو جائے گا جیسے گرم جوش دوست۔'' (حم السجدۃ : 34)

البتہ جو لوگ تبلیغ کے ذریعہ حق قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتے اور ظلم کا بازار گرم رکھنا چاہتے ہیں،تو پھر اُن کی برائی کا جواب ویسی ہی برائی سے دیا جاتا ہے ا :

وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا (الشوریٰ : 40)

''اور بُرائی کا بدلا تو اُسی طرح کی بُرائی ہے۔''

یہ ہے وہ توازن جو صرف دینِ اسلام کی امتیازی شان ہے۔اسلامی تعلیمات میں اصلاحِ حال کے لئے نرمی بھی اور سختی بھی،عفو و درگذر بھی ہے اور قصاص بھی،تبشیر بھی ہے اور انذار بھی۔

دورِ حاضر میں انقلابی عمل

- دورِ حاضر میں مسلح تصادم کے حوالے سے کچھ مشکلات درپیش ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے جس دائرۂ کار میں انقلاب کی تکمیل فرمائی،وہاں ایک منظّم ریاست قائم نہ تھی۔ہمیں اِس وقت ایک ایسے معاشرے میں کام کرنا ہے جہاں ایک ریاست منظّم اور موثر طاقت کے ساتھ کارفرما ہے اور وہ نہ صرف اجتماعی بلکہ بعض اعتبارات سے انفرادی معاملات زندگی پر بھی حاوی ہے۔پھر ریاست میں برسرِ اقتدار طبقہ کے پاس اپنے قائم کردہ نظام کے تحفظ کے لئے ہر طرح کے اسباب و وسائل اور لاکھوں کی تعداد میں جدید ترین ہتھیاروں سے لیس ،ہمہ وقت اور تربیت یافتہ افواج موجود ہیں۔ دوسری طرف عوام بالکل نہتے ہیں۔اِس وجہ سے حکومت کے خلاف کسی مسلح تصادم میں کامیابی کا امکان مشکل نظر آتا ہے۔
- مسلح تصادم کے حوالے سے مسلم معاشرے میں ایک اور مشکل یہ ہے کہ مقابلہ باطل نظام کے محافظ کلمہ گو مسلمانوں سے ہے۔کلمہ گو مسلمان حکمرانوں سے تصادم کے لئے فقہاء نے دو شرائط بیان کی ہیں۔پہلی یہ کہ حکمران کھلم کھلا کفر کا نفاذ کر رہے ہوں اور دوسری یہ کہ

مناسب اسباب اِس حد تک فراہم کر لئے جائیں کہ فتح کا غالب امکان محسوس ہو۔ یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ موجودہ دور میں اسباب یعنی ہتھیاروں اور عسکری تربیت کے اعتبار سے حکومت اور عوام میں بہت زیادہ عدم توازن ہے اور حکومت کے ساتھ مسلح تصادم کی صورت میں فتح کا امکان محسوس نہیں ہوتا۔

- اِن حالات میں اسلامی انقلاب کا آخری مرحلہ پُر امن اور غیر مسلح منظّم احتجاج کے ذریعہ طے کیا جا سکتا ہے۔ اِس احتجاج میں کسی ایسے منکر کے خلاف احتجاج کرنا ضروری ہوگا جس کا خلافِ شرع ہونا تمام دینی طبقات کے نزدیک مسلم ہو۔ مثال کے طور پر عریانی و فحاشی کی اشاعت، سودی معیشت کی ترویج وغیرہ۔ ایسے منکر کے خلاف اقدام ریاست کے اہم اداروں کے پُر امن گھیراؤ اور سول نافرمانی کی تحریک کے ذریعہ ہوسکتا ہے۔ اِن پُر امن اور منظّم مظاہروں کے ذریعہ سے حکومتِ وقت کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ اُس منکر کا قلع قمع کرے اور اِس کے سدباب کے لئے قانون سازی کرے۔ یہ طریقہ حکومت کے خلاف بغاوت کا نہیں اور نہ ہی قوم کو خانہ جنگی میں مبتلا کرنے کا ہے۔ پھر اِس طریقہ میں اقتدار کی طلب بھی نہیں بلکہ مسلمان حکمرانوں سے مسلم معاشرے میں منکرات کو ختم کرنے اور شریعتِ اسلامی کے مطابق قانون سازی کرنے کا مطالبہ ہے۔ اگر حکومت یہ مطالبہ نہیں مانتی تو پھر مظاہرین کو قید و بند کی صعوبتیں جھیلنے، تشدد برداشت کرنے اور یہاں تک کہ جانیں قربان کرنے کے لئے تیار رہنا ہوگا۔ یہ طرزِ عمل اُن صحابہ کرامؓ کے اُسوہ پر چلنے والا ہوگا جنہوں نے مکی دور میں ہر طرح کی تکالیف برداشت کیں لیکن جواب میں کوئی اقدام نہ کرتے ہوئے اپنے موقف پر ڈٹ کر صبر کا مظاہرہ کیا۔

البتہ اِس طرح کے پُر امن احتجاج سے قبل ضروری ہے کہ :

i- انقلابی جماعت نے اپنے معاشرے میں دعوت کا حق ادا کیا ہو۔ بڑی وضاحت کے ساتھ اسلامی انقلاب کے لئے جدوجہد کی فرضیت، اسلامی انقلاب کے برپا کرنے کی

اہمیت اور اُس کی برکات لوگوں کے سامنے پیش کی ہوں۔ ذہنوں میں اٹھنے والے سوالات واعتراضات کے جوابات دیے ہوں۔

ii- انقلابی جماعت میں شامل کارکنان نے اپنے اپنے دائرۂ کار میں شریعت کے احکامات پر امکانی حد تک عمل کر کے سیرت و کردار کا لوہا منوایا ہو۔ عوام الناس اُن کے قول و فعل کی مطابقت کے قائل ہوں۔ اُنہوں نے تزکیہ کے مراحل طے کئے ہوں، اُن کا مطلوب و مقصود اللہ کی رضا کا حصول اور نجاتِ اخروی ہو اور اُن کے دل راہِ حق میں جان دینے کے لئے بے چین ہوں۔

3- انقلابی جماعت ایک شخص کی قیادت میں احکامات سننے اور ماننے کے اصول پر پوری طرح سے منظّم ہو۔ مختلف مناصب پر تربیت یافتہ افراد فائز ہوں اور کارکنان، نظم کے خوگر ہونے کا ثبوت دے چکے ہوں۔

مندرجہ بالا مراحل طے کر کے ہی انقلابی جماعت کو انقلاب کے آخری مرحلے یعنی میدان میں آ کر پُر امن احتجاج کا آغاز کرنا چاہیئے۔

- پُر امن اور منظّم احتجاج کے تین ممکنہ نتائج برآمد ہو سکتے ہیں :

i- حکومت اِن مظاہروں کے نتیجے میں پسپائی اختیار کرے اور منکرات کے خاتمے اور حدود اللہ کے نفاذ کا آغاز کر دے۔ اِس طرح انقلابی جماعت ایک ایک منکر کو ختم کروا کر حدود اللہ کا نفاذ کرواتی رہے گی اور پورا نظام درست ہونے تک یہ جدوجہد جاری رہے گی۔

ii- حکومت انقلابی تحریک کو اپنے خلاف انا کا مسئلہ بنا لے اور اپنی بقاء اور مفادات کے تحفظ کے لئے تحریک کو مکمل طور پر کچلنے کا فیصلہ کرے۔ اِس صورت میں حکومت پر قابض مفاد یافتہ طبقات، ریاست کی پولیس اور فوج کو اِس تحریک کو کچلنے کے لئے بے دریغ استعمال کریں گے۔ لاٹھیاں برسائی جائیں گی، آنسو گیس کے شیل پھینکے

جائیں گے، گولیوں کی بوچھاڑ آئے گی اور گرفتاریاں ہوں گی۔ اگر لوگ اللہ کی راہ میں قربانیاں حتّٰی کہ جان دینے پر تیار ہوں اور ثابت قدمی سے میدان میں ڈٹے رہیں تو پولیس کتنوں کو گرفتار کرے گی اور کتنوں کو شہید کرے گی۔ بالآخر پولیس اور فوج جواب دے دے گی کہ یہ مظاہرین ہمارے ہی دینی بھائی اور ہم وطن ہیں۔ یہ کسی ذاتی غرض سے نہیں بلکہ اللہ کے دین کی سربلندی اور اُس کے نفاذ کے لئے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کے لئے نکلے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ حکومت کا تختہ الٹ جائے گا اور اِن شاء اللہ انقلابی تحریک کامیابی سے ہمکنار ہوگی۔ ماضی قریب میں اِس کی ایک مثال موجود ہے۔ **1977** ء میں نظامِ مصطفیٰ ﷺ کی تحریک کے دوران پاکستان فوج نے نہتے عوام پر گولی چلانے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن اُس وقت چونکہ کوئی ایک منظّم جماعت اقتدار سنبھالنے والی موجود نہ تھی، لہٰذا فوج نے اقتدار پر قبضہ کرلیا۔

iii - اگر حکومتِ وقت اِس تحریک کو کچلنے میں کامیاب ہوجائے، تو جن لوگوں نے اِس راستے میں جانیں دی ہوں گی، اُن کی قربانیاں ہرگز ضائع نہیں ہوں گی۔ اِن شاء اللہ وہ اجرِ عظیم اور فوزِ کبیر سے نوازے جائیں گے۔ ہم نظام کو بالفعل بدلنے کے مکلّف یعنی ذمہ دار نہیں ہیں، البتہ اُس کو بدلنے کی جدوجہد ہم پر فرض ہے۔ مزید برآں! اِن شاء اللہ اِنہی جانثاروں اور سرفروشوں کے خون اور ہڈیوں کی کھاد سے جلد یا بدیر کوئی نئی اسلامی انقلابی تحریک اُبھرے گی جو طاغوتی، استحصالی اور جابرانہ نظام کو للکارے گی۔ اِس طرح وہ وقت آ کر رہے گا جس کی خبر الصادق والمصدوق ﷺ نے دی ہے کہ پورے کرۂ ارضی پر اللہ کا دین اِسی طرح غالب ہو کر رہے گا جس طرح آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں جزیرہ نمائے عرب پر غالب ہوا تھا :

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے

یہ چمن معمور ہوگا نغمہ توحید سے

وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ

" تا کہ اللہ ظاہر کر دے کہ کون غیب میں رہتے ہوئے اُس کی اور اُس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے۔"

- آیت کے اِس حصہ میں لِيَعْلَمَ کا لفظی ترجمہ ہوگا اللہ جان لے۔ لیکن اللہ کا علم چونکہ علمِ قدیم ہے لہٰذا مناسب ترجمہ ہوگا کہ اللہ ظاہر کر دے کہ کون اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی مدد کرتا ہے غیب میں رہتے ہوئے۔ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی مدد سے مراد ہے اللہ کے دین کی مدد۔ دین اللہ کا ہے اور اُسے غالب کرنا، یہ مشن تھا اللہ کے رسول ﷺ کا۔ لہٰذا جو دین کے غلبہ کی جدوجہد کر رہا ہے وہ درحقیقت اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی مدد کر رہا ہے۔ یہ بات سورۃ الصّف کی آخری آیت میں اِس طرح بیان کی گئی :

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ہو جاؤ اللہ کے مددگار جیسا کہ پکارا تھا حضرت مریم کے بیٹے عیسیٰؑ نے اپنے ساتھیوں کو کہ کون ہے میرا مددگار اللہ کے لئے۔ ساتھیوں نے کہا کہ ہم ہیں اللہ کے مددگار۔"

- نصرتِ رسول ﷺ کے حوالے سے نبی اکرم ﷺ کا ایک بڑا پیارا اور خاص طور پر ہمارے لئے انتہائی امید افزا ارشاد ہے جو علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے درِّ منثور میں مسندِ ابن ابی شیبہ سے نقل کیا ہے :

يَا لَيْتَنِيْ قَدْ لَقِيْتُ اِخْوَانِيْ! قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَلَسْنَا اِخْوَانَكَ وَ اَصْحَابَكَ ؟ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنَّ قَوْمًا يَجِيْئُوْنَ مِنْ بَعْدِكُمْ، يُؤْمِنُوْنَ بِيْ اِيْمَانَكُمْ، وَيُصَدِّقُوْنِيْ تَصْدِيْقَكُمْ، وَيَنْصُرُوْنِيْ نَصْرَكُمْ، فَيَا لَيْتَنِيْ قَدْ لَقِيْتُ اِخْوَانِيْ

''اے کاش میں ملتا اپنے بھائیوں سے! صحابہؓ نے عرض کیا اے اللہ کے رسولؐ کیا ہم آپؐ کے بھائی اور ساتھی نہیں ہیں؟ آپؐ نے فرمایا کیوں نہیں! لیکن یہ وہ لوگ ہوں گے جو تمہارے بعد آئیں گے، مجھ پر ایسے ایمان لائیں گے جیسے تم ایمان لائے ہو اور میری اُسی طرح تصدیق کریں گے جیسے تم نے کی ہے اور اُسی طرح میری مدد کریں گے جیسے تم نے کی ہے، تو اے کاش میں ملتا اپنے بھائیوں سے۔

- آیت کے اِس حصہ میں اہلِ ایمان کو بہت بڑا اعزاز دیا جا رہا ہے کہ اگر وہ اللہ کے دین کے غلبہ کے لئے جہاد کریں گے تو اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے مددگار قرار پائیں گے۔ کہاں اللہ اور کہاں انسان۔ پھر کیا مقام و مرتبہ ہے اللہ کے رسول ﷺ کا اور کیا اوقات ہے ایک عام انسان کی۔ اللہ جو چاہے سو کر سکتا ہے لیکن ہمارے امتحان کے لئے اُس نے دین کی سربلندی کے لئے کوشش کا ہمیں حکم دیا ہے۔ وہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ کون ہے جو اُس کے نازل کرنا نظام عدل وقسط کو نافذ کرنے کے لئے اور اُس کی نازل کردہ میزان کو نصب کرنے کے لئے اپنا مال نذر کرتا ہے اور اپنی جان کی بازی لگاتا ہے۔ اب جو کوئی اِیسا کرے گا، وہ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کا مددگار قرار پائے گا۔ سچے اہل ایمان نہ صرف خود اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر کاربند ہوتے ہیں بلکہ عالم واقعہ میں جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے نظام کو قائم کرنے کی جدوجہد کرتے ہیں:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۞

''مومن تو بس وہ ہیں جو اللہ اور اُس کے رسولؐ پر ایمان لائے، پھر شک میں نہ پڑے اور اُنہوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا اپنے اموال اور اپنی جانوں کے ساتھ۔ یہی لوگ سچے ہیں۔'' (الحجرات: 15)

مال و جان سے جہاد کرنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہلِ ایمان کی قدر افزائی کی جاتی

ہے اور اللہ اُنہیں اپنا اور اپنے رسول ﷺ کا مددگار دیتا ہے۔ بندے کے لئے اِس سے بڑھ کر اور کوئی اونچا مقام نہیں ہوسکتا۔ خوش نصیب ہیں وہ بندے جو اللہ کے وفادار ہیں، اللہ اور اُس کے رسول سے سچی محبت کرنے والے ہیں اور اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے تن من دھن سے جہاد کرتے ہوئے اپنے لئے سعادتیں سمیٹ رہے ہیں۔ یہ سعادتیں بدرجہ اُتم صحابہ کرامؓ کے حصہ میں آئیں کہ اُنہوں نے پہلے اندونِ ملکِ عرب غلبۂ دین کے لئے اللہ کے رسول ﷺ کی نصرت کی اور پھر تھوڑے ہی عرصہ میں دنیا کے ایک بڑے حصہ تک اِس عادلانہ نظام کی توسیع کا کارنامہ انجام دیا۔ اِس حوالہ سے فاتحِ ایران حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے وہ الفاظ تاریخی ہیں جو اُنہوں نے ایران پر حملہ کا مقصد بیان کرتے ہوئے اِرشاد فرمائے تھے کہ:

اِنَّا قَدْ اُرْسِلْنَا لِنُخْرِجَ النَّاسَ مِنْ ظُلُمٰتِ الْجِهَالَةِ اِلٰى نُوْرِ الْاِیْمَانِ وَمِنْ جَوْرِ الْمُلُوْكِ اِلٰى عَدْلِ الْاِسْلَامِ

''بلاشبہ ہمیں بھیجا گیا ہے تاکہ ہم نکالیں لوگوں کو جہالت کے اندھیروں سے ایمان کے نور کی طرف اور بادشاہوں کے ظلم سے اسلام کے عدل کی طرف۔''

اللہ تعالیٰ ہمیں بھی صحابہ کرامؓ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اپنے دین کی خدمت کی توفیق نصیب فرمائے:

اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنَا اَنْ نُّجَاهِدَ فِیْ سَبِیْلِكَ بِاَمْوَالِنَا وَاَنْفُسِنَا - آمین

اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ ۞

''بے شک اللہ بڑا طاقتور اور زبردست ہے۔''

آیت کے اِس آخری حصہ کے ذریعہ اِس مغالطہ کی نفی کی گئی کہ اللہ عاجز و لاچار ہے اور بندوں سے مدد مانگ رہا ہے۔ دین کی سربلندی کی خاطر کوشش کرنے کا تقاضا، اللہ کی طرف سے صرف اِس لئے ہے تاکہ ہم اِس کے ذریعہ اپنے ایمان کی سچائی کا ثبوت فراہم کردیں۔ اِس

میں کوئی شک نہیں کہ اللہ بہت قوت والا اور زبردست ہے۔ اُس کی حکومت اپنے بل پر قائم ہے اور اُس کا اختیار پوری کائنات پر محیط ہے۔ اُسے کسی مدد کی ضرورت نہیں۔ وہ ایک حکم سے ظالموں کو نیست و نابود اور دینِ حق کو غلبہ عطا کر سکتا ہے۔ یہ اُس کی اپنے بندوں کے لئے قدر افزائی ہے کہ اگر وہ دین کے لئے مال صرف کریں تو وہ اِس کو اپنے ذمہ قرض سے تعبیر کرتا ہے اور اگر وہ اُس کے دین کے لئے اپنی جانیں کھپائیں تو وہ اِسے اپنی نصرت قرار دیتا ہے۔

منتخب نصاب حصّہ ششم

سورۂ حدید حصّہ ہفتم : آیات 26 تا 29

رہبانیت - دین کے تقاضوں سے فرار کی راہ

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۞ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۞

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّاِبْرَاهِيْمَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ وَّكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُوْنَ ۞ ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً وَرَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُوْنَ ۞ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۞ لِئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَلَّا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۞

- سورۂ حدید کے تیسرے حصہ میں یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ دینی تقاضوں سے پہلوتہی کی ایک بڑی وجہ ہے دنیا پرستی۔ اب سورۂ حدید کے اِس ساتویں اور آخری حصہ میں دینی تقاضوں سے فرار کی ایک اور وجہ بیان کی جا رہی ہے رہبانیت یعنی ترکِ دنیا۔ یہ وہ گمراہی ہے جو ضد ہے دنیا پرستی کی۔ ایک انتہا یہ ہے کہ انسان دنیا ہی کا ہو کر رہ جائے۔ لذاتِ دنیوی اور دنیا کی آسائش و آرام ہی اُس کا مقصود و مطلوب بن جائے۔ اُس کی بھاگ دوڑ اور محنت و مشقت کا مقصد ہو زیادہ سے زیادہ دنیا کمانا، کاروبار کو جمانا، مال اور اثاثہ جات کو ترقی دینا اور دنیا میں کسی منصب، حیثیت، اقتدار اور وجاہت کو حاصل کرنا۔ یہ دنیا پرستی انسان کو غافل کر دیتی ہے دینی ذمہ داریوں کی ادائیگی سے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں اللہ نے فرمایا:

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ۞ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ۞

''کیا ہم تمہیں بتائیں وہ لوگ جو سب سے زیادہ خسارے میں ہیں اپنی محنت کے اعتبار سے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی محنتیں برباد ہو گئیں دنیا کی زندگی کے لئے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اُنہوں نے خوب کمائی کی ہے۔'' (کہف : 103 - 104)

دوسری انتہا ہے رہبانیت یعنی ترکِ دنیا۔ یہ ہے نفس کشی یعنی نفس کے جذبات اور اُس کی جائز خواہشات و شہوات کو بھی کچل دینا۔ شادی بیاہ، کاروباری معاملات اور لذاتِ دنیا کو اللہ سے تعلق کی راہ میں رکاوٹ سمجھنا اور اِن سے بچنے کے لئے آبادیوں سے دور جنگلوں میں جا بسنا۔ وہاں راہب خانوں یا غاروں میں نفس کشی کے لئے ریاضتیں کرنا۔ یہ طرزِ عمل بھی دینی ذمہ داریوں سے گریز کی ایک صورت ہے جس میں انسان دنیا کے نظام کو شیطانی قوتوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر خود اپنی ذات ہی کے تزکیہ میں لگ جاتا ہے۔ باطل قوتوں کو اپنی عیاشیوں اور ظلم و ستم کے لئے کھلی چھٹی مل جاتی ہے اور وہ پوری آزادی سے

نوعِ انسانی کا استحصال کر کے اُن کی دنیا بھی برباد کرتی ہیں اور اُنہیں آخرت کی تیاری سے بھی محروم کر دیتی ہیں۔

- رہبانیت کی گمراہی کا آغاز حضرت عیسیٰؑ پر ایمان رکھنے والوں نے کیا۔ یہ دراصل ردِّعمل تھا یہود کی دنیا پرستی کا جو حضرت عیسیٰؑ کے بدترین دشمن تھے۔ یہود دنیا پرستی کی اُس انتہا پر پہنچے کہ اُن کے علماء نے فتویٰ فروشی اور کتمانِ حق کے ذریعہ دین کو بھی دنیا کی کمائی کا ذریعہ بنالیا۔ جب حضرت عیسیٰؑ کی بعثت ہوئی اور اُنہوں نے علمائے یہود کے جرائم کو بے نقاب کیا تو اُنہوں نے حضرت عیسیٰؑ پر مرتد ہونے کا بہتان لگا کر اُنہیں مصلوب کرنے کی کوشش کی۔ یہود کی دشمنی کے ردِّعمل میں عیسائی دنیاداری سے اِس قدر بیزار ہوئے کہ وہ ترکِ دنیا کی گمراہی تک جا پہنچے۔ سورۂ فاتحہ میں صراطِ مستقیم کے ذکر کے بعد، مسندِ احمد کی ایک روایت کے مطابق، یہود کو مَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ قرار دیا گیا کیونکہ اُنہوں نے صراطِ مستقیم سے ہٹ کر بے اعتدالی ایک راہ اختیار کی اور عیسائیوں کو اَلضَّآلِّيۡنَ کہا گیا کیونکہ وہ بے اعتدالی کی دوسری انتہا پر پہنچ گئے۔

- سورۂ حدید کے اِس حصہ میں دینی تقاضوں سے گریز کے حوالے سے عیسائیوں کی ایک گمراہی یعنی رہبانیت کی نفی کی گئی ہے۔ اُن قوموں میں سے جو اپنی نسبت رسولوں کی طرف کرتی ہیں، عیسائی وہ پہلی قوم تھے جنہوں نے رہبانیت کی ابتداء کی۔ اِس مقام پر عیسائیوں کے ذکر سے قبل، سب سے پہلے رسول حضرت نوحؑ اور ابو الانبیاء حضرت ابراہیمؑ کا ذکر کیا گیا۔

☆ آیت : **26** :

وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا وَّاِبۡرٰهِيۡمَ -- اور ہم نے بھیجا نوحؑ اور ابراہیمؑ کو --
وَجَعَلۡنَا فِىۡ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالۡكِتٰبَ -- اور جاری کیا اُن دونوں کی اولاد میں

نبوت اور اور کتابوں کا سلسلہ -- فَمِنۡهُمۡ مُّهۡتَدٍ -- تو کچھ اُن میں سے ہدایت پر رہے -- وَّكَثِيۡرٌ مِّنۡهُمۡ فٰسِقُوۡنَ ۞ اور اکثر اُن میں سے نافرمان نکلے۔

- اِس آیت میں سب سے پہلے حضرت نوحؑ کا ذکر ہے۔ حضرت نوحؑ پہلے نبی ہیں جن کو رسول بنایا گیا۔ اُن کی رسالت کا دور تقریباً چار ہزار قبلِ مسیح ہے۔ اُن کی قوم کردستان کے علاقہ میں آباد تھی۔ اُنہوں نے **950** برس تک اپنی قوم کو تبلیغ کی۔ اُن کی قوم بت پرستی کے شرک میں مبتلا تھی۔ قوم کے پانچ مشہور بتوں کے نام ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر تھے۔ اُنہوں نے قوم کو توحید کی دعوت دی اور صاف فرمایا کہ میرے پیشِ نظر تمہاری خیر خواہی ہے۔ میں تم سے کسی اجر کا طلب گار نہیں ہوں۔ اُن کی دعوت پر صرف چند ایسے لوگ ایمان لائے جو معاشرے کے غریب اور نادار طبقات میں سے تھے۔ قوم کی اکثریت نے اُن کی دعوت کو رد کر دیا۔ جب قوم، حضرت نوحؑ کے خلاف سرکشی کی آخری انتہا تک پہنچ گئی تو اُنہوں نے قوم کے خلاف اللہ سے بددعا کی کہ اَنِّىۡ مَغۡلُوۡبٌ فَانۡتَصِرۡ بے شک میں مغلوب ہوا چاہتا ہوں (اے اللہ) بدلہ لے (القمر :**10**)۔ اللہ نے فریاد سنی حضرت نوحؑ کی اور اُنہیں ایک کشتی بنانے کا حکم دیا۔ اِس کے بعد زمین میں ایک تنور سے پانی ابلنا شروع ہوا اور آسمان سے بارش برستی رہی۔ اللہ کے حکم پر حضرت نوحؑ اور تمام اہلِ ایمان کشتی میں سوار ہو گئے۔ دیگر مخلوقات کا ایک ایک جوڑا بھی کشتی میں سوار کر لیا گیا۔ زمین سے ابلنے اور آسمان سے برسنے والے پانی کی اِس قدر کثرت ہوئی کہ زبردست طوفان آ گیا۔ اِس طوفان سے پوری کافر قوم ہلاک ہو گئی۔ حضرت نوحؑ اور اُن کے ساتھ کشتی میں سوار ہونے والے اِس عذاب سے محفوظ رہے۔

- حضرت ابراہیمؑ کا زمانہ **1861** قبل مسیح کا ہے۔ آپ عراق کے شہر اُر میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ایک ایسے ماحول میں جنم لیا جہاں ایک طرف ستارہ پرستی، سورج پرستی، چاند پرستی اور بت پرستی کی صورت میں مذہبی شرک اپنے عروج پر تھا اور دوسری طرف نمرود

خدائی کا دعویدار تھا اور قوم اُسے خدا تسلیم کر کے سیاسی شرک کا بھی ارتکاب کر رہی تھی۔
حضرت ابراہیمؑ نے شرک کی اِن دونوں قسموں کی بڑے زوردار انداز سے مخالفت کی اور قوم کو اِن سے باز رہنے کی تلقین کی۔ قوم نے اُن کی دعوت کو قبول نہیں کیا اور اِس کے برعکس وہ اُن کی جان کی دشمن ہوگئی۔ پھر اُنہیں آگ کے ایک جوش مارتے ہوئے الاؤ میں ڈال دیا گیا لیکن اللہ نے ایک معجزے کے ذریعہ اُن کی حفاظت فرمائی۔ جو قوم نبی کی جان کی دشمن ہو جائے، اُس سے کسی خیر کی توقع نہیں ہوتی، لہٰذا حضرت ابراہیمؑ نے اپنے علاقے سے ایمان لانے والے چند ساتھیوں سمیت ہجرت کی۔ اِس کے بعد اُنہوں نے جزیرہ نما عرب کے مختلف علاقوں میں دعوتِ توحید کو عام کرنے کا مشن جاری رکھا اور کئی مقامات پر اِس دعوت کے مراکز قائم کیے۔ اللہ نے آپ کو تین بیٹے عطا کیے۔ پہلے حضرت اسمٰعیلؑ جن کو آپ نے مکہ میں آباد کیا، دوسرے اسحاقؑ جن کو آپ نے فلسطین میں بسایا اور تیسرے حضرت مدیان جن کو مکہ اور فلسطین کے درمیان کے علاقہ میں سکونت دی۔

- حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیمؑ کا ذکر کرنے کے بعد اللہ نے فرمایا کہ ہم نے اُن دونوں ہی کی نسل میں رکھ دی نبوت اور کتاب۔ حضرت نوحؑ کو آدمِ ثانی بھی کہا جاتا ہے کیوں کہ اُن کے بعد نسلِ انسانی اُن ہی کی اولاد سے جاری رہی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُ هُمُ الْبٰقِيْنَ ۞

''اور ہم نے اُن کی اولاد کو ہی کردیا باقی رہنے والا۔'' (صافات: 77)

حضرت نوحؑ کے تین بیٹے حضرت سام، حضرت حام اور حضرت یافث ایمان لے آئے اور بعد میں اِن ہی سے نسلِ انسانی جاری ہوئی اور ظاہر ہے کہ سلسلۂ نبوت بھی پھر حضرت نوحؑ ہی کی نسل میں باقی رہا۔ حضرت ابراہیمؑ، حضرت سام کی نسل میں سے تھے۔ اللہ نے حضرت ابراہیمؑ پر اپنی عنایات کی بارش فرمادی:

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِلّٰهِ حَنِيْفًا ؕ وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۞ شَاكِرًا

لِّاَنْعُمِهٖ ؕ اِجْتَبٰهُ وَهَدٰهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۞ وَاٰتَيْنٰهُ فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً ؕ وَاِنَّهٗ فِى الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۞ (النحل: 120 - 122)

''بیشک ابراہیمؑ اپنی ذات میں اللہ کی ایک فرمانبردار امت تھے اور بالکل یکسو تھے (اللہ کی بندگی کے لئے) اور وہ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے۔ اُس کی نعمتوں کے شکرگزار تھے، اللہ نے اُن کو چن لیا تھا اور سیدھی راہ پر چلایا تھا۔ اور ہم نے اُن کو دنیا میں بھی بھلائی دی اور وہ آخرت میں بھی نیک لوگوں میں سے ہوں گے۔''

اللہ نے اپنے ساتھ اُنہیں یہ نسبت دی کہ اپنا خلیل بنالیا (النساء: 125)، لوگوں کے ساتھ یہ اعزاز بخشا کہ اُن کے لئے امام کے مرتبہ پر فائز فرمایا (البقرۃ: 124) اور انبیاء کے ساتھ اِس تعلق سے نوازا کہ ابوالانبیاء کی شان عطا کی یعنی اُن کے بعد تمام انبیاء اُن ہی کی ذریت میں سے تھے۔ حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد میں سے تھے نبی اکرم ﷺ۔ حضرت اسحاقؑ کی نسل میں کئی انبیاء آئے۔ اِن میں سب سے پہلے تھے حضرت یعقوبؑ اور آخری تھے حضرت عیسیٰؑ۔ حضرت مدیان کی نسل میں سے تھے حضرت شعیبؑ۔

- آیت کے آخر میں فرمایا فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ - تو کچھ اُن میں سے ہدایت پر رہے اور اکثر اُن میں سے نافرمان نکلے۔ حضرت نوحؑ کے چار بیٹوں میں سے جہاں تین ایمان لائے وہیں ایک بیٹا کنعان ایمان لانے سے محروم رہا۔ اللہ نے جب قوم پر عذاب نازل کیا تو اُس کو بھی طوفان میں غرق کردیا۔ حضرت نوحؑ نے جب اللہ سے اُس کے حق میں شفاعت کرنا چاہی تو اللہ نے جواب دیا:

يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ (ھود: 46)

''اے نوحؑ! وہ تیرے گھر والوں میں سے نہیں، اُس کا عمل ٹھیک نہیں تھا۔''

گویا اللہ کے نزدیک اہمیت نسلی تعلق کی نہیں بلکہ انسان کی سیرت و کردار کی ہے۔ اِسی طرح حضرت ابراہیمؑ کی نسل میں سے وہ بھی تھے جنہوں نے راہِ ہدایت کو اختیار کی، اُس

پر گامزن ہوئے اور اُسی پر کاربند رہے۔ البتہ اکثریت ایسے لوگوں کی ہوئی کہ جنہوں نے راہِ ہدایت کو چھوڑ دیا، اللہ کی طے کردہ حدود سے تجاوز کیا اور گمراہی میں بہت دور نکل گئے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد کے حوالے سے بارگاہِ خداوندی میں عرض کیا :

فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ ۚ وَمَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّکَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿﴾

"سو اُن میں سے جس نے میری پیروی کی، اُس کی مجھ سے نسبت ہے اور جس نے میری نافرمانی کی تو (اے اللہ) تو بخشنے والا مہربان ہے۔" (ابراہیمؑ : 36)

اقبال نے کیا خوب کہا ہے :

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو
پھر پسر قابلِ میراثِ پدر کیونکر ہو

یہ آیت تھی تمہیدی نوعیت کی۔ اب اگلی آیت سے اصل مضمون کا آغاز ہوتا ہے۔

☆ آیت : **27** :

ثُمَّ قَفَّیْنَا عَلٰٓی اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا -- پھر ہم نے اُن ہی کے نقشِ قدم پر بھیجا اپنے رسولوں کو -- وَقَفَّیْنَا بِعِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ -- اور اُن کے پیچھے بھیجا عیسیٰؑ یعنی مریم کے بیٹے کو -- وَاٰتَیْنٰهُ الْاِنْجِیْلَ -- اور دی اُن کو انجیل -- وَجَعَلْنَا فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً -- اور رکھی اُن کے دلوں میں جنہوں نے اُن کی پیروی کی نرمی اور مہربانی -- وَرَهْبَانِیَّةَ نِ ابْتَدَعُوْهَا -- اور رہبانیت (کی بدعت) اُنہوں نے (خود) شروع کی -- مَا کَتَبْنٰهَا عَلَیْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ -- ہم نے اُن کو اِس کا حکم نہیں دیا تھا مگر اللہ کی رضا کے حصول کے لئے -- فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَایَتِهَا -- پھر اُنہوں نے اُس کو نہیں نبھایا جیسا کہ اُس کو نبھانے کا حق تھا -- فَاٰتَیْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ --

پس ہم نے دیا اُن کو جو اُن میں سے ایمان لائے اُن کا اجر -- وَکَثِیْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿﴾ اور اُن میں سے اکثر نافرمان ہیں۔

- اِس آیت میں فرمایا گیا کہ اللہ نے حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیمؑ کے بعد پے بہ پے کئی رسول بھیجے۔ عَلٰٓی اٰثَارِهِمْ سے مراد یہ ہے کہ تمام رسولوں کی دعوت اور مقصد ایک ہی تھا۔ سورۂ نساء آیت **165** میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰهِ حُجَّةٌ ۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ وَکَانَ اللّٰهُ عَزِیْزًا حَکِیْمًا ﴿﴾

"(سب) رسولوں کو (اللہ نے) خوشخبری سنانے والے اور خبردار کرنے والے (بنا کر بھیجا تھا) تاکہ رسولوں کے آنے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے سامنے کوئی حجت نہ رہے اور اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا ہے۔"

- اِس کے بعد حضرت عیسیٰؑ کا ذکر ہے جو حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے حضرت اسحاقؑ کی ذریت میں سے آخری رسول ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کے بعد نبی اکرم ﷺ کی بعثت ہوئی لیکن آپ ﷺ کا تعلق حضرت ابراہیمؑ کے بڑے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کی نسل سے تھا۔ حضرت عیسیٰؑ کو اللہ نے انجیل عطا فرمائی اور اُن کے پیروکاروں یعنی عیسائیوں کو اللہ نے ایک خاص باطنی وصف عطا فرمایا یعنی دلوں میں نرمی اور گداز۔
- دل میں نرمی اور گداز کی کیفیت اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا اِرشاد ہے کہ :

مَنْ یُّحْرَمِ الرِّفْقَ یُحْرَمِ الْخَیْرَ کُلَّهٗ

"جو دل کی نرمی سے محروم کیا گیا وہ کل کے کل خیر سے محروم کر دیا گیا۔" (مسلم)

یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ عیسائیوں کے دلوں میں نرمی کی کیفیت دراصل ردِ عمل تھا اُن یہودیوں کے طرزِ عمل کا جن کے دلوں کی سختی اپنی آخری حد تک پہنچ گئی تھی۔ ایک طرف وہ

دنیا داری میں بری طرح ملوث ہو کر احکاماتِ شریعت کو پامال کرنے میں جری تھے اور دوسری طرف حضرت عیسیٰؑ کی دشمنی میں انتہائی پستی پر اتر آئے تھے۔ یہودیوں کے دلوں کی سختی کا ذکر اسی سورۃ کی آیت **16** میں اِس طرح آیا:

وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُوْنَ ﴿﴾

''اور لوگ نہ ہو جائیں اُن کی طرح جن کو کتابیں دی گئی تھیں اِس سے پہلے، پھر اُن پر زمانہ طویل گزر گیا (غفلت میں) تو سخت ہو گئے اُن کے دل اور اُن میں سے اکثر نافرمان ہیں۔''

سورۂ بقرۃ آیت **74** میں یہ مضمون زیادہ وضاحت سے آیا ہے:

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿﴾

''پھر اِس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے گویا وہ پتھر ہیں یا ان سے بھی زیادہ سخت اور پتھر تو بعضے ایسے ہوتے ہیں کہ اُن میں سے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ پھٹ جاتے ہیں اور اُن میں سے پانی بہنے لگتا ہے اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے گر پڑتے ہیں اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔''

- عیسائیوں کی رقتِ قلبی کے ذکر کے بعد اب وہ مضمون آ رہا ہے جس کے لئے ایک طویل تمہید باندھی گئی۔ یہود کی قساوتِ قلبی اُنہیں دنیا داری کی انتہا پر لے گئی اور عیسائیوں کی رقتِ قلبی، ترکِ دنیا کی گمراہی تک جا پہنچی۔ عیسائیوں نے کاروباری معاملات اور شادی بیاہ کے تعلق کو اللہ کے ساتھ لو لگانے اور آخرت کی تیاری کی راہ میں رکاوٹ سمجھا۔ اُنہوں نے اللہ کی رضا کے حصول کے لئے رَہبانیت کی بدعت ایجاد کر لی۔ طے کیا کہ ہم آبادیوں

سے دور غاروں اور راہب خانوں میں رہ کر اللہ اللہ کریں گے، سبزیوں پر گزارا کریں گے، نہ شادی کریں گے، نہ کاروبار کریں گے اور نہ مرغن غذائیں استعمال کریں گے۔ اُنہوں نے یہ سب نیک نیتی سے کیا تھا۔ **مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ** کے دو مفہوم ممکن ہیں۔ پہلا یہ کہ ہم نے اُن کو رہبانیت کا حکم نہیں دیا تھا مگر اِس بات کا کہ اللہ کی رضا حاصل کریں۔ یعنی اللہ کی رضا جوئی کو اپنا مقصود و مطلوب اور نصب العین بنالیں۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے اُن پر رہبانیت اختیار کرنا لازم نہ کیا تھا مگر اُنہوں نے اللہ کی رضا کے حصول کے لئے ایک غیر فطری طریقہ خود سے ایجاد کر لیا۔ بہر حال عیسائیوں کا رہبانیت اختیار کرنا کسی فسادِ نیت کی بنیاد پر نہیں تھا بلکہ جو کچھ کیا تھا اللہ کی رضا جوئی کے لئے کیا تھا لیکن اُن کا نیکی کا جذبہ حدِ اعتدال سے تجاوز کر گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے اُن کی رہبانیت کا تذکرہ مذمت کے اسلوب میں نہیں کیا۔

- آیت کے اگلے حصہ میں فرمایا **فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا**۔ پھر اُنہوں نے اُس کو نہیں نبھایا جیسا کہ اُس کو نبھانے کا حق تھا۔ رہبانیت کے نام پر اپنے لئے چند پابندیاں اختیار کر لیں لیکن پھر اُن کو نبھا نہ سکے۔ انسان کے فطری تقاضے اور داعیاتِ نفس بڑے منہ زور ہیں۔ اُن کو کچلنے کی کوشش میں انسان لازماً شکست سے دوچار ہوتا ہے۔ رہبانیت کے پردے میں وہ کچھ ہوا کہ اِس کی تاریخ بدترین دنیا داری اور ہوس پرستی کے واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ بظاہر زہد کا لبادہ اوڑھے رکھا لیکن درحقیقت اللہ اور بندے کے درمیان واسطہ اور وسیلہ بن کر، نذرانوں اور صدقات کی وصولی کے ذریعہ عوام الناس کا خون نچوڑا گیا۔ اِسی لئے اقبال نے کہا:

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اُٹھا دو

راہب خانوں میں راہب اور راہبائیں تجرد کی زندگی بسر کرتے ہوئے اللہ اللہ کرتے

ہوئے دکھائی دیے لیکن اندرونی طور پر شہوت رانی اور درندگی اِس انتہا کو پہنچی کہ راہب خانوں کے تہہ خانوں سے ناجائز بچوں کے قبرستان برآمد ہوئے۔ گویا زہد کے پردے میں بدکاریاں بھی جاری رہیں اور ناجائز اولاد کے گلے بھی گھونٹے جاتے رہے۔

- آیت کے آخری حصہ میں فرمایا فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ - پس ہم نے دیا اُن کو جو اُن میں سے ایمان لائے اُن کا اجر اور اُن میں سے اکثر نافرمان ہیں۔ ایمان لانے والوں سے مراد وہ راست باز عیسائی ہیں جو نبی اکرم ﷺ پر ایمان لانے کی سعادت سے بہرور ہوئے۔ اِن میں سب سے نمایاں ہیں حبشہ کے بادشاہ شاہ نجاشیؓ۔ اِس کے علاوہ اور بھی عیسائی، وفود کی صورت میں مکہ آ کر حلقہ بگوشِ اسلام ہوتے رہے۔ اِن کے ایمان لانے اور اجر و ثواب کا تذکرہ اللہ نے اِس طرح کیا:

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۞ وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ۞ وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ ۙ وَنَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ ۞ فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِيْنَ ۞

''تم دیکھو گے کہ مومنوں کے ساتھ سب سے زیادہ دشمنی کرنے والے یہودی اور مشرک ہیں اور دوستی کے لحاظ سے مومنوں کے قریب تر اُن لوگوں کو پاؤ گے جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ اِس لئے کہ اُن میں عالم بھی ہیں اور اللہ سے ڈرنے والے بھی اور وہ تکبر نہیں کرتے۔ اور جب اُنہوں نے سنا اُس کلام کو جو رسول ﷺ پر نازل کیا گیا تو تم دیکھتے ہو کہ اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اِس لئے کہ اُنہوں نے حق بات پہچان

لی اور وہ (اللہ کی جناب میں) عرض کرنے لگے کہ اے رب! ہم ایمان لے آئے، پس ہمیں شامل فرما لے (حق کی) گواہی دینے والوں میں اور ہمیں کیا ہوا ہے کہ ہم ایمان نہ لائیں اللہ پر اور اُس حق پر جو ہمارے پاس آ چکا ہے اور ہم اُمید رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہمیں نیک بندوں کے ساتھ (جنت میں) داخل کرے گا۔ تو اللہ نے ان کو اِس کہنے کے عوض (جنت کے) باغ عطا فرمائے جن کے نیچے سے نہریں بہہ رہی ہیں وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے اور نیکوکاروں کا یہی صلہ ہے۔'' (المائدۃ: 82 - 85)

البتہ یہ بھی حقیقت ہے کہ عیسائیوں میں ایمان لانے والوں کی تعداد قلیل تھی اور اُن کی اکثریت فسق و فجور کے اندر مبتلا ہو چکی تھی۔ سینٹ پال نے تثلیث، کفارہ اور شریعت کے ساقط ہونے کے گمراہ نظریات کے ذریعہ عیسائیت کو پال ازم بنا دیا اور بے عملی کی انتہا پر پہنچا دیا۔

- اِس آیت میں رہبانیت کا آغاز کرنے کے حوالے سے اِبْتَدَعُوْا کا لفظ آیا ہے۔ اِس لفظ کے مادّہ ب د ع سے ایک اہم اصطلاح بنتی ہے ''بدعت''۔ گویا رہبانیت ایک بدعت تھی جو عیسائیوں نے ایجاد کی۔ جس طرح شرک، توحید کی ضد ہے، بالکل اِسی طرح بدعت ضد ہے سنت کی۔ بدعت کا آغاز کرنے والے سنت پر عمل سے محروم کر دیے جاتے ہیں۔ اِرشادِ نبوی ﷺ ہے:

مَا اَحْدَثَ قَوْمٌ بِدْعَةً اِلَّا رُفِعَ مِثْلُهَا مِنَ السُّنَّةِ فَتَمَسُّكٌ بِسُنَّةٍ خَيْرٌ مِّنْ اِحْدَاثِ بِدْعَةٍ. (مسند احمد)

''نہیں ایجاد کرتی کوئی قوم کسی بدعت کو لیکن اُٹھا لی جاتی ہے اُسی مانند کوئی سنت، لہٰذا سنت کو مضبوطی سے تھامنا بہتر ہے بدعت ایجاد کرنے سے۔''

سلف صالحین کے نزدیک بدعت ایک ایسا نو ایجاد طریقۂ عبادت ہے جس کا آغاز ثواب حاصل کرنے کی نیت سے رسول اللہ ﷺ اور خلفاء راشدین کے بعد کیا گیا ہو لیکن وہ

دورِ نبوی ﷺ یا دورِ خلافتِ راشدہ میں داعیہ اور سبب موجود ہونے کے باوجود نہ قولاً ثابت ہو نہ فعلاً نہ صراحۃً اور نہ ہی اشارۃً۔ گویا بدعت کا آغاز یہ ثابت کرنا ہے کہ دین، عہد رسالت ﷺ میں مکمل نہیں ہوا تھا یا پھر رسول اللہ ﷺ پر خیانت کی تہمت لگانا ہے کہ ثواب کے بعض کاموں سے آپ ﷺ نے امت کو بے خبر رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ احادیثِ مبارکہ میں بدعت کی شدید مذمت آئی ہے :

مَنْ اَحْدَثَ فِیْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَیْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ (بخاری ،مسلم)

''جو شخص ہمارے دین میں کوئی نئی چیز داخل کرے جو دین میں داخل نہیں وہ مردود ہے''۔

اِنَّ اَصْدَقَ الْحَدِیْثِ کِتَابُ اللّٰهِ وَاَحْسَنَ الْهَدْیِ هَدْیُ مُحَمَّدٍ وَّشَرَّ الْاُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا وَکُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَّکُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ وَّکُلَّ ضَلَالَةٍ فِی النَّارِ

''بلاشبہ سب سے سچا کلام اللہ کی کتاب ہے اور بہترین طریقہ محمد ﷺ کا طرزِ عمل ہے اور بدترین کام وہ ہے جو نیا ایجاد کیا جائے اور ہر نیا ایجاد کیا گیا کام بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے اور گمراہی آگ میں لے جانے والی ہے''۔ (نسائی)

وَعَظَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ مَوْعِظَةً وَّجِلَتْ مِنْهَا الْقُلُوْبُ، وَذَرَفَتْ مِنْهَا الْعُیُوْنُ، فَقُلْنَا: یَارَسُوْلَ اللّٰهِ کَاَنَّهَا مَوْعِظَةُ مُوَدِّعٍ فَاَوْصِنَا، قَالَ: اُوْصِیْکُمْ بِتَقْوَی اللّٰهِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَاِنْ تَاَمَّرَ عَلَیْکُمْ عَبْدٌ، وَاَنَّهٗ مَنْ یَّعِشْ مِنْکُمْ فَسَیَرٰی اِخْتِلَافاً کَثِیْراً، فَعَلَیْکُم بِسُنَّتِیْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ الْمَهْدِیِّیْنَ عَضُّوْا عَلَیْهَا بِالنَّوَاجِذِ، وَاِیَّاکُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْاُمُوْرِ، فَاِنَّ کُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ

''(صحابہ کرامؓ بیان کرتے ہیں کہ) ہمیں نصیحت فرمائی اللہ کے رسول ﷺ نے ایسی نصیحت کہ جس کو سن کر (ہمارے) دل دہل گئے (ہماری) آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ پھر ہم نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! یہ نصیحت تو گویا رخصت کرنے والے کی وصیت لگتی ہے تو آپ ہمیں وصیت فرمائیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں تمہیں وصیت کرتا

ہوں اللہ کی نافرمانی سے بچنے کی اور اپنے حاکموں کے احکام سننے اور قبول کرنے کی، خواہ وہ حاکم ایک حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو، کیوں کہ میرے بعد جو زندہ رہے گا وہ بہت اختلاف دیکھے گا پس تم میری سنت اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت کو اپنے اوپر لازم کرلو اور اُس کو دانتوں سے مضبوط تھام لو، اور نئی نئی باتوں سے بچتے رہو، کیوں کہ ہر نئی جاری کی ہوئی چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے''۔ (ابوداؤد ، ترمذی)

اَنَا فَرَطُکُمْ عَلَی الْحَوْضِ فَمَنْ وَرَدَهٗ شَرِبَ مِنْهُ وَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ لَمْ یَظْمَاْ بَعْدَهٗ اَبَدًا، لَیَرِدُ عَلَیَّ اَقْوَامٌ اَعْرِفُهُمْ وَیَعْرِفُوْنِیْ ثُمَّ یُحَالُ بَیْنِیْ وَبَیْنَهُمْ فَاَقُوْلُ اِنَّهُمْ مِنِّیْ فَیُقَالُ اِنَّکَ لَا تَدْرِیْ مَا بَدَّلُوْا بَعْدَکَ فَاَقُوْلُ سُحْقًا سُحْقًا لِّمَنْ بَدَّلَ بَعْدِیْ

''میں تم سب سے پہلے اُس حوض (یعنی کوثر) پر پہنچ جاؤں گا۔ تو جو کوئی اُس پر پہنچا اور اُس نے اُس میں سے پی لیا تو اُسے کبھی بھی پیاس نہ لگے گی۔ (اُس حوض پر) میرے پاس کچھ لوگ آئیں گے۔ میں اُنہیں پہچان لوں گا اور وہ لوگ مجھے پہچان لیں گے۔ پھر میرے اور اُن کے درمیان ایک آڑ حائل کردی جائے گی تو میں کہوں گا کہ یہ تو میرے اُمتی ہیں، اِس پر مجھ سے کہا جائے گا کہ آپ کو نہیں معلوم کہ اُنہوں نے آپ کے بعد (دین کو) بدل ڈالا تھا۔ پھر میں کہوں گا دوری ہو دوری ہو اُس سے جو بدل دے (دین کو) میرے بعد''۔ (بخاری)

مسندِ احمد میں روایت ہے کہ :

اِنَّ الشَّیْطَانَ قَالَ وَعِزَّتِکَ یَا رَبِّ لَا اَبْرَحُ اُغْوِیْ عِبَادَکَ مَا دَامَتْ اَرْوَاحُهُمْ فِیْ اَجْسَادِهِمْ قَالَ الرَّبُّ وَعِزَّتِیْ وَجَلَالِیْ لَا اَزَالُ اَغْفِرُ لَهُمْ مَا اسْتَغْفَرُوْنِیْ

''بلاشبہ شیطان نے کہا قسم ہے تیری عزت کی اے رب! میں برابر تیرے بندوں کو گمراہ کرتا رہوں گا جب تک اُن کی روحیں اُن کے جسم میں ہیں۔ رب تعالیٰ نے فرمایا قسم ہے میری عزت کی اور بلندی مرتبت کی کہ میں برابر اُنہیں معاف کرتا رہوں گا جب تک وہ مجھ سے بخشش مانگتے رہیں گے۔''

شیطان نے پھر یہ تدبیر کی کہ انسانوں کو بدعات میں لگا دو جنہیں وہ گناہ نہیں بلکہ ثواب کا کام سمجھیں اور اب ایسے کاموں پر اللہ سے بخشش مانگنے کا امکان ہی باقی نہ رہے۔

- دینِ اسلام میں رہبانیت کی بدعت کی بڑی سختی کے ساتھ سے نفی کی گئی ہے تا کہ اُمتِ مسلمہ کو اِس گمراہی سے محفوظ رکھا جا سکے۔۔امام ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں نبی اکرم ﷺ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْاِسْلَامِ - اسلام میں کوئی رہبانیت نہیں۔ بلاشبہ اسلام دینِ فطرت ہے۔ اِس دین میں ضبطِ نفس (self control) ہے، نفس کشی (self annihilation) نہیں ہے۔ تمام فطری وجبلی تقاضوں کی چند حدود و قیود کے ساتھ تسکین کا بھرپور سامان ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ

''(اے نبیؐ) پوچھیے کس نے حرام کیا اُس زیب وزینت کو اور اُس پاکیزہ رزق کو جو اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا فرمایا ہے؟'' (الاعراف: 32)

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

اَلزَّهَادَةُ فِي الدُّنْيَا لَيْسَتْ بِتَحْرِيْمِ الْحَلَالِ وَلَا اِضَاعَةِ الْمَالِ وَلٰكِنَّ الزَّهَادَةَ فِي الدُّنْيَا اَنْ لَّا تَكُوْنَ بِمَا فِي يَدَيْكَ اَوْثَقَ مِمَّا فِيْ يَدِ اللّٰهِ

''دنیا میں زہد کے معنی یہ نہیں کہ آدمی حلال چیزوں کو اپنے اوپر حرام کر لے اور نہ یہ کہ مال کو ضائع کرے، لیکن زہد کے معنی یہ ہیں کہ تمہیں زیادہ اعتماد اُس شے پر ہو جو اللہ کے ہاتھ میں ہے بہ نسبت اُس کے جو تیرے ہاتھوں میں ہے۔'' (ترمذی)

آپ ﷺ نے اپنے بعض ساتھیوں کو ترکِ دنیا کی طرف مائل پایا تو بڑی سختی سے منع فرمایا:

لَا تُشَدِّدُوْا عَلٰى اَنْفُسِكُمْ فَيُشَدَّدَ عَلَيْكُمْ، فَاِنَّ قَوْماً شَدَّدُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ فَشَدَّدَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ، فَتِلْكَ بَقَايَاهُمْ فِي الصَّوَامِعِ وَالدِّيَارِ

''اپنے اوپر زیادہ سختی نہ کرو ورنہ تم پر سختی کی جائے گی، پھر بے شک ایک قوم (یعنی عیسائیوں) نے اپنے اوپر سختی کی تو اللہ نے اُن پر سختی کی پس راہب خانوں اور گرجوں میں اُن کے بقایا بیٹھے ہیں۔'' (ابوداؤد)

بخاری و مسلم میں ایک واقعہ نقل ہوا ہے کہ:

جَاءَ ثَلٰثَةُ رَهْطٍ اِلٰى اَزْوَاجِ النَّبِيِّ ﷺ يَسْئَلُوْنَ عَنْ عِبَادَةِ النَّبِيِّ ﷺ فَلَمَّا اُخْبِرُوْا بِهَا كَاَنَّهُمْ تَقَالُّوْهَا فَقَالُوْا اَيْنَ نَحْنُ مِنَ النَّبِيِّ ﷺ غَفَرَ اللّٰهُ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ وَمَا تَاَخَّرَ فَقَالَ اَحَدُهُمْ اَمَّا اَنَا فَاُصَلِّيْ الَّيْلَ اَبَدًا وَقَالَ الْاٰخَرُ اَنَا اَصُوْمُ النَّهَارَ اَبَدًا وَلَا اُفْطِرُ وَقَالَ الْاٰخَرُ اَنَا اَعْتَزِلُ النِّسَاءَ فَلَا اَتَزَوَّجُ اَبَدًا فَجَاءَ النَّبِيُّ ﷺ اِلَيْهِمْ فَقَالَ اَنْتُمُ الَّذِيْنَ قُلْتُمْ كَذَا وَ كَذَا اَمَا وَاللّٰهِ اِنِّيْ لَاَخْشَاكُمْ لِلّٰهِ وَاَتْقٰكُمْ لَهٗ لٰكِنِّيْ اَصُوْمُ وَاُفْطِرُ وَاُصَلِّيْ وَاَرْقُدُ وَاَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ

''تین جماعتیں نبی ﷺ کی بیویوں کے پاس آپ ﷺ کی عبادت کا حال و کیفیت پوچھنے آئیں۔ جب اُنہیں آپ ﷺ کی عبادت کی کیفیت بتائی گئی تو گویا اُنہوں نے آپ ﷺ کی عبادت کو کم سمجھا۔ پھر اُن لوگوں نے کہا ہم کہاں اور نبی ﷺ کہاں یعنی ہمیں آپ ﷺ سے کیا نسبت۔ اللہ تعالیٰ نے تو اُن کے اگلے پچھلے گناہوں کو معاف کر دیا ہے۔ پھر اُن میں سے ایک شخص نے کہا میں تو اب تمام رات نماز پڑھا کروں گا۔ دوسرے نے کہا میں ہمیشہ دن کو روزہ رکھا کروں گا اور کبھی دن میں افطار نہیں کروں گا۔

ایک اور نے کہا میں عورتوں سے الگ رہوں گا اور کبھی نکاح نہیں کروں گا۔ اتنے میں اُن کے پاس نبی ﷺ تشریف لائے اور فرمایا تم ہی وہ لوگ ہو جنہوں نے یہ یہ کہا ہے۔ سنو اللہ کی قسم! میں تمہاری نسبت اللہ سے سے زیادہ ڈرتا ہوں اور اُس کی نافرمانی سے بچنے کا زیادہ خیال رکھتا ہوں، مگر (دیکھو) میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور (کسی دن) نہیں بھی رکھتا ہوں اور (رات میں) نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ پس جو شخص میری سنت سے منہ موڑے گا اُس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔'' (بخاری)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص ؓ کو عبادات سے بہت شغف تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے کو عبادات کے حوالے سے اُن کے معمولات کی خبر ہوئی تو آپ ﷺ نے اُن سے فرمایا:

يَا عَبْدَ اللّٰهِ اَلَمْ اُخْبَرْ اَنَّکَ تَصُوْمُ النَّهَارَ وَتَقُوْمُ الَّيْلَ فَقُلْتُ بَلٰى يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ فَلَا تَفْعَلْ صُمْ وَاَفْطِرْ وَقُمْ وَنَمْ فَاِنَّ لِجَسَدِکَ عَلَيْکَ حَقًّا وَّاِنَّ لِعَيْنِکَ عَلَيْکَ حَقًّا وَّاِنَّ لِزَوْجِکَ عَلَيْکَ حَقًّا وَّاِنَّ لِزَوْرِکَ عَلَيْکَ حَقًّا

''اے عبداللہ! کیا مجھے خبر نہیں کی گئی کہ تم دن بھر روزے سے رہتے ہو اور رات بھر نفل نماز پڑھتے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ جی ہاں اے اللہ کے رسول ﷺ۔ آپ ﷺ نے فرمایا ایسا نہ کرو۔ (نفلی) روزہ رکھا کرو اور چھوڑا بھی کرو اور رات میں نماز پڑھو اور سویا بھی کرو۔ پس بے شک تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے اور بے شک تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے اور بے شک تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے اور بے شک تم سے ملنے آنے والے کا بھی تم پر حق ہے۔ (بخاری)

- بدعت کی نفی اور سنت کے احیا کا کام ہمارے ایمان کا لازمی تقاضا ہے اور اِس حوالے سے ہمیں کسی مداہنت یا مصلحت سے کام نہیں لینا چاہیئے۔ ارشاداتِ نبوی ﷺ ہیں:

مَا مِنْ نَّبِيٍّ بَعَثَهُ اللّٰهُ فِی اُمَّتِهٖ مِنْ قَبْلِیْ اِلَّا کَانَ لَهٗ فِی اُمَّتِهٖ حَوَارِيُّوْنَ وَ اَصْحَابٌ يَّاْخُذُوْنَ بِسُنَّتِهٖ وَ يَقْتَدُوْنَ بِاَمْرِهٖ ثُمَّ اِنَّهَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِهِمْ

خُلُوْفٌ يَّقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ وَ يَفْعَلُوْنَ مَالَا يُؤْمَرُوْنَ فَمَنْ جَاهَدَ هُمْ بِيَدِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَ هُمْ بِلِسَانِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَ هُمْ بِقَلْبِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَ لَيْسَ وَرَآءَ ذٰلِکَ مِنَ الْاِيْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ (مسلم)

''اللہ تعالیٰ نے مجھ سے پہلے کسی امت میں کوئی نبیؑ نہیں بھیجا مگر یہ کہ اُس کے کچھ حواری اور صحابی ہوتے تھے جو اُس نبیؑ کی سنت پر عمل کرتے تھے اور اُس کے احکامات کی پیروی کرتے تھے۔ پھر اُن کے بعد اُن کے جانشین ایسے لوگ بن جاتے ہیں جو کہتے وہ ہیں جو کرتے نہیں اور کرتے وہ ہیں جس کا حکم ہی نہیں دیا گیا۔ تو جو کوئی اُن سے ہاتھ سے جہاد کرے گا وہ مومن شمار ہوگا اور جو کوئی اُن سے زبان سے جہاد کرے گا وہ مومن شمار ہوگا اور جو کوئی اُن سے دل سے جہاد کرے گا وہ مومن شمار ہوگا اور اِس کے بعد تو رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں''۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ الدِّيْنَ بَدَاَ غَرِيْبًا وَسَيَعُوْدُ کَمَا بَدَاَ فَطُوْبٰى لِلْغُرَبَآءِ وَهُمُ الَّذِيْنَ يُصْلِحُوْنَ مَا اَفْسَدَ النَّاسُ مِنْ بَعْدِیْ مِنْ سُنَّتِیْ (ترمذی)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''یہ دین ایک اجنبی صورت میں شروع ہوا اور یہ پھر ویسا ہی ہو جائے گا جیسے شروع ہوا تھا تو اِن اجنبی پردیسیوں کے لئے خوشخبری ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جو اِس بگاڑ کی اصلاح کریں گے جو میرے بعد لوگوں نے میری سنت میں پیدا کر دیا ہوگا''

- دراصل یہ شیطان ہے جو اللہ کے نیک بندوں کو کونوں کھدروں، خانقاہوں اور آبادیوں سے دور غاروں میں بٹھا کر عبادات اور ریاضتوں کی راہ سجھاتا ہے تاکہ معاشرے میں ظلم و ستم کرنے والوں کو کھلی چھوٹ مل جائے اور وہ بغیر کسی مزاحمت کے لوٹ کھسوٹ جاری رکھیں۔ شیطان انسان کا ازلی دشمن ہے۔ وہ ایک ہی ہتھیار سے سب کو شکار نہیں کرتا۔ اول تو وہ سیدھی راہ کی طرف آنے ہی سے روکتا ہے۔ اگر کوئی شخص شیطانی حملوں کا مقابلہ کرتے ہوئے ایمان اور عملِ صالح کی منزلیں طے کر رہا ہے، تو شیطان اُس کی توجہ

آخری منزل یعنی اِقامتِ دین کی جدوجہد سے ہٹا کر تزکیہ ٔ نفس کے خانقاہی تصور کی طرف پھیر دیتا ہے۔ بس اپنی ہی ذات کو رگڑے جاؤ، اِسی کو مانجھے جاؤ اور اِسی کو سنوارے جاؤ۔ لگے رہو نمازوں میں، روزانہ روزے رکھنے میں، مشغول رہو پوری پوری رات عبادات میں لیکن میرے مقابلے میں نہ آؤ، میرے نظام کو چیلنج نہ کرو، استحصالی واستبدادی نظام کے لیے خطرہ نہ بنو۔ ذاتی نیکی کے اعتبار سے انتہائی پارسا شخص کا ذکر ایک حدیث میں یوں بیان کیا گیا:

قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اَوْحَى اللهُ اِلٰى جِبْرَئِيْلَ اَنِ اقْلِبْ مَدِيْنَةَ كَذَا وَ كَذَا بِاَهْلِهَا فَقَالَ يَا رَبِّ اِنَّ فِيْهِمْ عَبْدَكَ فُلَانًا لَمْ يَعْصِكَ طَرْفَةَ عَيْنٍ قَالَ فَقَالَ اقْلِبْ عَلَيْهِ وَعَلَيْهِمْ فَاِنَّ وَجْهَهٗ لَمْ يَتَمَعَّرْ فِيَّ سَاعَةً قَطُّ

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جبرائیلؑ کی طرف وحی فرمائی (اور حکم دیا) کہ فلاں شہر کو مع اُس کے باشندوں کے اُلٹ دو۔ جبرائیلؑ نے عرض کی: اے پروردگار! اُن لوگوں میں تو تیرا فلاں بندہ بھی ہے جس نے پلک جھپکنے کے دوران (یعنی ایک لمحہ) بھی تیری نافرمانی نہیں کی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اُس شہر کو دیگر باشندوں کے ساتھ اُس پر بھی الٹ دو، کیوں کہ (شہر والوں کے کرتوتوں پر) میری خاطر اُس کا چہرہ ایک گھڑی بھی متغیر نہیں ہوا۔'' (بیہقی)

غور کیجئے ایک شخص یہاں تک آ گیا کہ اُس نے اللہ کو پہچان لیا اور طے بھی کر لیا کہ مجھے اللہ ہی کی رضا حاصل کرنی ہے۔ گویا اُس کا نصب العین بھی درست ہو گیا۔ پھر یہ کہ اپنے نفس کی شرارتوں پر بھی قابو پا لیا۔ اب آخرت کی تیاری کے لئے گناہوں سے بچ رہا ہے، حرام خوری سے اجتناب کر رہا ہے اور فواحش ومنکرات سے بالکل دور ہے۔ انتہا یہ ہے کہ پلک جھپکنے میں بھی اللہ کی نافرمانی نہیں کر رہا، لیکن آخری مرحلے پر شیطان جو داؤ اور اڑنگا لگاتا ہے وہ یہ ہے کہ اب اُس کا رخ موڑ دیتا ہے صرف اپنی ذاتی اصلاح ہی کی طرف تاکہ وہ

کہیں نظام کی اصلاح کے لیے میدان میں نہ آ جائے اور اُس کی نیکی کہیں بدی کے لیے چیلنج نہ بن جائے۔ اِس **over emphasis on self purification** کی نفی قرآنِ حکیم میں اِس طرح آئی:

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبٰٓئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ﴿﴾ (النساء: 31)

''اگر تم اُن بڑے بڑے گناہوں سے جن سے تم کو منع کیا جاتا ہے اجتناب کرو گے تو ہم تمہارے (چھوٹے چھوٹے) گناہ معاف کر دیں گے اور تمہیں عزت کے مکانوں میں داخل کریں گے۔''

اللہ کے محبوب بندوں کی صفات میں سے ایک صفت یہ بھی ہے کہ اُن کی توجہ بڑے بڑے گناہوں سے بچنے یعنی فرائض ادا کرنے اور حرام سے پرہیز کرنے پر ہوتی ہے۔ اپنے کردار میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر توجہات کو زیادہ مرکوز کرنے سے صورت وہ پیدا ہوتی کہ مچھر چھانے جاتے ہیں لیکن سالم اونٹ نگل لئے جاتے ہیں۔ کمائی حرام کی ہے لیکن کھانا کھاتے وقت مسنون طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ

''جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کی باتوں سے اجتناب کرتے ہیں سوائے کچھ آلودگیوں کے۔ بے شک اے نبیؐ آپ کا رب بڑی بخشش والا ہے۔'' (النجم: 32)

وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ (الشوریٰ: 37)

''اور جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کی باتوں سے پرہیز کرتے ہیں۔''

علامہ اقبال اپنی معرکۃ الآراء نظم ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' میں پیغام دیتے ہیں کہ ابلیسی نظام کو اصل خطرہ مسلمانوں سے ہے کہ کہیں وہ بیدار ہو کر پھر سے اسلام کے عادلانہ نظام

کو غالب کرنے کے لئے سرگرم نہ ہو جائیں۔ ابلیس کہتا ہے :

ہر نفس ڈرتا ہوں اِس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات

ابلیس اپنے خطرات کے سدباب کے لئے مسلمانوں کا یہ علاج تجویز کرتا ہے کہ :

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اِسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اِسے !

نبی اکرم ﷺ نے اِس کے برعکس امت مسلمہ کو میدان میں نکل کر باطل کے خلاف مال و جان سے جہاد کرنے کی تلقین فرمائی۔ مسندِ احمد میں آپ ﷺ کا ارشاد نقل ہوا :

لِكُلِّ نَبِيٍّ رَهْبَانِيَّةٌ وَرَهْبَانِيَّةُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اَلْجِهَادُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

''ہر نبی کے لئے رھبانیت ہے اور اِس امت کی رہبانیت ہے اللہ کی راہ میں جہاد کرنا۔''

بقول اقبال :

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری
کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری

اسلام کی تعلیمات کا حاصل یہ ہے کہ دنیا میں ہماری توجہ ظلم کے خاتمہ اور باطل کے استیصال کی طرف رہے۔ ہم ایک انقلابی عمل میں مصروف رہ کر باطل کے ساتھ اُس وقت تک پنجہ آزمائی کرتے رہیں جب تک دینِ حق غالب نہ ہو جائے۔ انقلابی عمل کے دوران بھی تکالیف اور مصائب آئیں گے، فاقوں کی نوبت آئے گی، پیٹ پر پتھر بھی باندھنے پڑیں گے، راتوں کو سونا نصیب نہیں ہوگا۔ مختصراً یہ کہ وہ ساری مشکلات اور مصائب جو خواہ مخواہ ایک تکلف و تصنع کی شکل میں نظامِ رہبانیت میں انسان اپنے اوپر طاری کرتا ہے، سب کے سب آئیں گے، لیکن اب وہ کارآمد (**productive**) ہوں گے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اِس طرح کی مشقتوں کے نتیجہ میں معاشرے میں عدل قائم ہوگا

اور لوگوں کو سکون میسر آئے گا۔ رہبانیت کا نظام تو درحقیقت ایک اعتبار سے ظلم اور شر کو تقویت پہنچاتا ہے۔ نیک لوگ میدان سے ہٹ جاتے ہیں اور معاشرہ میں ظالموں اور شریروں کو کھلی چھٹی مل جاتی ہے۔ اب اُنہیں کوئی چیلنج کرنے والا نہیں ہوتا اور وہ لوٹ کھسوٹ کی آخری حد کو پہنچ جاتے ہیں۔

☆ آیت : **28** :

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا -- اے لوگو جو ایمان لائے ہو! -- **اتَّقُوا اللّٰهَ** -- اللہ کی نافرمانی سے بچو -- **وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ** -- اور ایمان لاؤ اُس کے رسولؐ پر -- **يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ** -- وہ دے گا تمہیں دو حصے اپنی رحمت سے -- **وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ** -- اور دے گا تمہیں وہ نور جس کے ساتھ تم چل سکو گے -- **وَيَغْفِرْ لَكُمْ** -- اور تمہیں بخش دے گا -- **وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ** ﴿﴾ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

- اِس آیت میں **يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا** کے مخاطب دو گروہ ہیں۔ سورۃ کا اختتامی حصہ ہونے کے اعتبار سے اور پوری سورۃ کے مضامین کی مناسبت سے خطاب کا رُخ مسلمانوں کی طرف ہے اور پچھلی آیت کے ساتھ ربطِ مضمون کے اعتبار سے خطاب کا رُخ عیسائیوں کی طرف ہے جو نبی اکرم ﷺ سے پہلے مبعوث ہونے والے تمام انبیاء پر ایمان رکھتے تھے۔ اِس آیت میں دونوں مخاطبین کو تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ تقویٰ کے لغوی معنی ہیں بچنا۔ اصطلاحی طور پر تقویٰ کا مفہوم ہے اللہ کی نافرمانی یا اللہ کی ناراضگی سے بچنا۔ ابنِ کثیرؒ نے سورۃ البقرۃ کی تفسیر کے آغاز میں حضرت ابی بن کعبؓ کے الفاظ میں تقویٰ کی بڑی عمدہ وضاحت نقل کی ہے :

سَاَلَ عُمَرُ (اُبَيَّ بْنِ كَعْبٍ) عَنِ التَّقْوٰى، فَقَالَ لَهٗ اَمَاسَلَكْتَ طَرِيْقاً ذَا

شَوْکِ؟ قَالَ بَلٰی، قَالَ فَمَا عَمِلْتَ؟ قَالَ شَمَّرْتُ وَاجْتَهَدْتُّ، قَالَ فَذٰلِکَ التَّقْوٰی

حضرت عمرؓ نے پوچھا (حضرت ابی ابن کعبؓ سے) تقویٰ کیا ہے؟ تو اُنہوں نے دریافت کیا کہ کیا کبھی آپ ایسے کسی راستہ سے گزرے ہیں جو کانٹے دار جھاڑیوں کے درمیان ہو؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا جی ہاں۔ حضرت ابی بن کعبؓ نے سوال کیا کہ پھر آپؓ کیا کرتے ہیں؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا میں اپنا لباس سمیٹتا ہوں اور جسم کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ حضرت ابی بن کعبؓ نے فرمایا یہی تقویٰ ہے۔

گویا تقویٰ ترکِ دنیا کی نفی ہے۔ تقویٰ اصل میں یہ ہے کہ دنیا میں بھرپور زندگی بسر کرنا، نکاح بھی کرنا اور اپنی گزر اوقات کے لئے معاشی بھاگ دوڑ بھی کرنا لیکن شیطانی حملوں سے خود کو بچاتے ہوئے دامنِ کردار کو گناہوں اور نافرمانیوں سے پاک رکھنا، بقولِ شاعر:

دنیا میں ہوں، دنیا کا طلب گار نہیں ہوں
بازار سے گزرا ہوں، خریدار نہیں ہوں

تقویٰ دراصل ایک باطنی کیفیت کا نام ہے۔ مسلم شریف کی ایک روایت کے مطابق آپ ﷺ نے تین بار اپنے قلبِ مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ''اَلتَّقْوٰی هٰهُنَا'' یعنی تقویٰ دل میں ہوتا ہے۔ تقویٰ کی وجہ سے انسان پر ہر وقت خدا خوفی اور اُخروی جواب دہی کا احساس طاری رہتا ہے، لہٰذا وہ اللہ کی نافرمانی سے بچتا ہے۔ انسان کو اللہ کی بارگاہ میں قربت تقویٰ کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے نہ کہ رہبانیت اختیار کرنے سے:

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰکُمْ ط (الحجرات: 13)

''اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ متقی ہے۔''

- اِس آیت میں مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے کہ تم نے سن لیا کہ اللہ تعالیٰ کی کیا شان ہے اور

اُس کی کیا صفات ہیں۔ تم پر دین کے تقاضے بھی واضح ہو گئے، اِن تقاضوں کو ادا کرنے والوں کا حسین انجام بھی بیان کر دیا گیا اور تقاضوں کی ادائیگی سے گریز کی صورت میں برے انجام کی وعید سے بھی تمہیں خبردار کر دیا گیا۔ دنیا کی زندگی کے فریب کا پردہ بھی تم پر چاک کر دیا گیا اور اِس دنیا میں وقوع پذیر ہونے والے حادثات کی حقیقت سے بھی تمہیں آگاہ کر دیا گیا۔ تمہیں یہ بھی بتا دیا گیا کہ اللہ کے دین کی نصرت وہ اعلیٰ ترین عمل ہے جس سے انسان کو اللہ اور اُس کے رسولوں کا مددگار بننے کا اعزاز حاصل ہوتا ہے۔ اِس اعلیٰ عمل سے محروم کرنے کے لئے ترکِ دنیا کے شیطانی فریب کو بھی تم پر کھول دیا گیا۔ اب تم پر حجت پوری ہو گئی۔ اب خیر اِسی میں ہے کہ اللہ کی نافرمانی سے بچو اور دین کے تقاضے ادا کرو۔

دوسری طرف عیسائیوں سے کہا جا رہا ہے کہ تم اِس سے پہلے تمام انبیاء پر ایمان رکھنے کی سعادت سے بہرور ہو۔ اب آخری رسول تشریف لا چکے ہیں، اِن پر بھی ایمان لے آؤ اور اِس حوالے سے اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کر کے ہمیشہ ہمیش کی سعادتوں سے محروم نہ ہو جاؤ۔

- اٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ کے الفاظ مسلمانوں کو دعوت دے رہے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ پر اِس طرح ایمان لاؤ جیسا کہ ایمان لانے کا حق ہے۔ تمہیں ''اِقْرَارٌ م بِاللِّسَانِ'' یعنی زبانی اقرار کی بنیاد پر قانونی ایمان تو حاصل ہے لیکن اب ''تَصْدِیْقٌ م بِالْقَلْبِ'' یعنی یقینِ قلبی کے حصول کی کوشش کر کے ایمانِ حقیقی سے باطن کو منور کرو۔ یہ وہی انداز ہے جو سورۂ نساء کی آیت **136** میں آیا ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ

''اے اہلِ ایمان! ایمان لاؤ اللہ اور اُس کے رسولؐ پر۔''

اِس آیت میں ایمان بالرسالت پر زور اِس لئے دیا گیا اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کے لئے ایک کامل اور متوازن نمونہ (**model**) صرف اور صرف نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ بابرکت میں ہے۔ دیگر جذبات کی طرح نیکی کا جذبہ بھی اندھا ہوتا ہے اور بعض اوقات بڑھ کر

رہبانیت کی صورت اختیار کرسکتا ہے۔ اِسے حدود میں رکھنے کے لئے متوازن رہنمائی اللہ کے رسول ﷺ کے طرزِ عمل ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب : **21**)

''یقیناً تمہارے لئے اللہ کے رسول ﷺ کی ذاتِ مبارکہ میں بہترین نمونہ ہے۔''

یہ وہ اسوۂ حسنہ ہے جس میں نہ دنیا پرستی ہے اور نہ ترکِ دنیا، اللہ کی قربت کے حصول کے لئے نفسانی خواہشات پر گرفت (**control**) بھی ہے لیکن فطری جذبات کی تسکین کا سامان بھی، تزکیۂ نفس کے لئے مشقتیں بھی ہیں لیکن نہ غیر فطری ریاضتیں ہیں اور نہ تپسیائیں۔ البتہ آپ ﷺ کے اُسوہ سے صحیح رُخ پر استفادہ کے لئے دو باتیں اہم ہیں۔ پہلی یہ کہ آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے انفرادی و اجتماعی دونوں گوشوں سے متعلق سنت کے جو پہلو ہیں، اِن سب پر عمل کی کوشش کی جائے۔ دوسرے یہ کہ سنت کے تمام اجزاء کے مابین نسبت وتناسب وہی قائم رہے جو رسول اللہ ﷺ کے معمولات میں تھا۔ اگر وہاں کوئی عمل تولہ ہے تو اپنے معمولات میں بھی اُسے تولہ ہی رکھا جائے۔ اگر اِسے سیر کردیا تو سیرت پر عمل کی صورت ہی بدل جائے گی۔ ہم بعض فروعی اور اختلافی نوعیت کی سنتوں پر تو بہت حساس ہو جاتے ہیں لیکن آپ ﷺ کی سیرتِ مبارکہ میں نمایاں ترین اور مسلسل نظر آنے والی سنتوں کو فراموش کردیتے ہیں۔ آپ ﷺ کی سب کی بڑی اور مؤکد ترین سنت ہے دعوت وتبلیغ جس کا ہدف تھا اقامتِ دین یعنی اللہ کے دین کو غالب کرنا۔ ظہورِ نبوت کے بعد آپ ﷺ نے کسی غار یا خانقاہ میں بیٹھ کر چلہ کشی، مراقبے یا ریاضتیں نہیں کیں بلکہ دعوت وتبلیغ کے ذریعہ لوگوں کو غفلت کے اندھیروں سے نکالا، منظّم کیا اور باطل سے ٹکرا کر حق کا بول بالا کردیا۔ دنیا میں لوگوں کو ایک عالانہ نظام کی چھتری تلے سکون ملا اور آخرت کی تیاری کے لئے بھی ایک سازگار فضا فراہم ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی آپ ﷺ کے مبارک اُسوہ کی پیروی کی توفیق مرحمت فرمائے۔ اللہ کی رضا

اور محبت رہبانیت سے نہیں آپ ﷺ کی پیروی سے ملے گی :

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۞ (آلِ عمران: **31**)

''(اے نبیؐ) کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو، تو محبت کے ساتھ میری پیروی کرو، اللہ بھی تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ معاف کردے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے''۔

- آیت کے اگلے حصہ میں فرمایا جو بھی نبی اکرم ﷺ پر ایمان لائے گا اور آپ ﷺ کی پیروی کرے گا، اُسے اللہ کی رحمت کے دو حصے ملیں گے۔ ایک اپنی انفرادی نیکی کا اور دوسرا دعوت وتبلیغ کی سنت پر عمل کرکے لوگوں کو حق کی راہ کی طرف لانے کا۔ حدیثِ مبارکہ ہے :

مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً فَيُعْمَلُ بِهَا كَانَ لَهُ اَجْرُهَا، وَمِثْلُ اَجْرِ مَنْ عَمِلَ بِهَا لَا يَنْقُصُ مِنْ اُجُوْرِهِمْ شَيْئاً

''جس نے کسی بھلائی کو جاری کیا پھر اُس پر عمل کیا تو اُس کے لئے اجر ہے اور اُس کا اجر بھی ہے جس نے اِس بھلائی پر عمل کیا بغیر عمل کرنے والے کے اجر میں کمی کیے ہوئے۔'' (ابنِ ماجہ)

عیسائیوں سے خطاب کے حوالے سے اُنہیں خوشخبری دی جارہی ہے کہ اگر وہ اللہ کے آخری رسول ﷺ پر بھی ایمان لے آئیں گے تو اُن کے لئے رحمت کے دو حصے یعنی دوہرا اجر ہوگا۔ اِس بشارت کا ذکر آیا ہے سورۃ القصص کی آیات **52** تا **54** میں :

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ۞ وَاِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ ۞ اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۞

''جن لوگوں کو ہم نے اِس سے پہلے کتاب دی تھی وہ اِس پر ایمان لا رہے ہیں۔ اور جب (قرآن) اُن کو پڑھ کر سنایا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اِس پر ایمان لائے بیشک وہ

ہمارے رب کی طرف سے برحق ہے (اور) ہم تو اِس سے پہلے بھی مسلمان تھے (یعنی تمام انبیاء پر ایمان رکھتے تھے)۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اُن کو دگنا بدلا دیا جائے گا کیونکہ اُنہوں نے صبر کیا اور برائی کا بدلہ اچھائی سے دیتے ہیں اور جو (مال) ہم نے اُن کو دیا ہے اُس میں سے خرچ کرتے ہیں۔''

مسلم شریف کی ایک روایت کے مطابق نبی اکرم ﷺ نے بھی اپنے ایک مبارک ارشاد میں اسلام قبول کرنے والے اہلِ کتاب کو دوہرے اجر کی خوشخبری دی ہے :

ثَلاَثَةٌ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُمْ مَرّتَيْنِ: رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ اٰمَنَ بِنَبِيّهٖ وَاَدْرَكَ النَّبِيَّ ﷺ فَاٰمَنَ بِهٖ وَاتَّبَعَهٗ وَصَدَّقَهٗ، فَلَهٗ أَجْرَانِ، وَعَبْدٌ مَّمْلُوْكٌ اَدّٰى حَقَّ اللّٰهِ تَعَالٰى وَحَقَّ سَيِّدِهٖ، فَلَهٗ أَجْرَانِ، وَرَجُلٌ كَانَتْ لَهٗ اَمَةٌ فَغَذَاهَا فَاَحْسَنَ غِذَائَهَا ثُمّ اَدّبَهَا فَاَحْسَنَ اَدَبَهَا ثُمّ اَعْتَقَهَا وَتَزَوَّجَهَا، فَلَهٗ أَجْرَانِ

''تین قسم کے لوگ وہ ہوں گے جنہیں (روزِ قیامت) دوہرا اجر ملے گا۔ ایک اہلِ کتاب میں سے وہ شخص جو اپنے نبیؑ پر ایمان رکھتا تھا اور اُس نے پایا نبی اکرم ﷺ کا زمانہ (جو اب قیامت تک کے لئے ہے) تو وہ آپ ﷺ پر ایمان لے آیا اور آپ ﷺ کی پیروی کی اور آپ ﷺ کی تصدیق کی تو اُس کے لئے دوہرا اجر ہے۔ دوسرا وہ غلام جس نے حق ادا کیا اللہ تعالیٰ کا اور اپنے آقا کا بھی تو اُس کے لئے دوہرا اجر ہے۔ تیسرا وہ شخص جس کی کوئی کنیز تھی تو اُس نے اُسے اچھی غذا دی (یعنی عمدہ پرورش کی)، پھر اُس کی اچھی تربیت کی، پھر اُسے آزاد کر دیا اور اُس سے نکاح کر لیا تو اُس کے لئے بھی دوہرا اجر ہے۔''

- اِس آیت میں دوسری نوید یہ سنائی گئی کہ اللہ کے رسول ﷺ پر ایمان اور اُن کی پیروی اختیار کرنے کی صورت میں اللہ تمہیں وہ نور عطا فرمائے گا جس کی مدد سے تم چل سکو گے۔ اِس بشارت کا تعلق دنیا سے بھی ہے اور آخرت سے بھی۔ ایمان سے وہ بصیرتِ باطنی حاصل ہوگی جو انسان کو صراطِ مستقیم پر چلنے کے لئے درکار ہے۔ سنت نبوی ﷺ وہ نور ہے

جو زندگی کے ہر ہر معاملے میں کامل، معتدل اور متوازن رہنمائی عطا فرماتا ہے۔ خاص طور پر انقلابی جدوجہد کے دوران درپیش آنے والے مراحل کے لئے رہنمائی صرف اور صرف آپ ﷺ ہی کی سیرت سے ملے گی کیونکہ تاریخِ نبوت و رسالت میں آپ ﷺ ہی وہ واحد نبی ہیں جن کے ذریعہ ایک انقلابی عمل ابتدا سے آخر تک پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ آخرت کے اعتبار سے یہ وہ نور ہوگا جس کا ذکر اِسی سورۃ کی آیت 12 میں آچکا ہے۔ وہ نور جس کے ذریعہ روزِ قیامت پل صراط کا کٹھن مرحلہ طے کر کے جنت کی لازوال نعمتوں تک رسائی حاصل ہو سکے گی۔

- آیت کے بالکل آخر میں تیسری بشارت دی گئی کہ اللہ اُن لوگوں کی تمام خطائیں معاف کر دے گا جو اللہ کے رسول پر ایمان لا کر آپ ﷺ کے نقشِ قدم پر چلیں گے اور اللہ تو ہے ہی بخشنے والا، رحم فرمانے والا۔ یہ خوشخبری مسلمانوں کے لئے بھی ہے اور بالخصوص اُن عیسائیوں کے لئے بھی جو آپ ﷺ کی تعلیمات پر ایمان لے آئیں کیونکہ آپ ﷺ نے حضرت عمرو بن العاصؓ سے اُن کے قبولِ اسلام کے وقت فرمایا :

اَمَا عَلِمْتَ اَنَّ الاِسْلَامَ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهٗ؟ وَاَنَّ الْهِجْرَةَ تَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهَا؟ وَاَنَّ الْحَجّ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهٗ؟

''کیا تم جانتے نہیں ہو کہ بے شک اِسلام قبول کرنا پچھلے تمام گناہوں کو مٹا دیتا ہے؟ اور بے شک ہجرت کا عمل پچھلے تمام گناہوں کو مٹا دیتا ہے؟ اور بے شک حج کی عبادت پچھلے تمام گناہوں کو مٹا دیتی ہے؟'' (مسلم)

☆ آیت : 29 :

لِئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ -- تا کہ اہلِ کتاب یہ نہ جانیں -- اَلَّا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰهِ -- کہ وہ اختیار نہیں رکھتے کچھ بھی اللہ کے فضل پر -- وَاَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ -- اور بے شک فضل اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے -- يُؤْتِيْهِ مَنْ

يَّشَاءُ -- وہ دیتا ہے اِسے جسے وہ چاہے -- وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ﴿﴾ اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

سورہ ٔ حدید کی اِس آخری آیت میں اہلِ کتاب کے لئے دلجوئی اور امید دلانے کا اُسلوب ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی بعثت کے بعد اہلِ کتاب کو اُن کے بعض جرائم کی وجہ سے امت کے منصب اور دنیا میں اللہ کی نمائندگی کی سعادت سے محروم کر دیا گیا اور اُن کی جگہ نبی اکرم ﷺ پر ایمان لانے والوں کو یہ اعزاز بخشا گیا۔ سورہ ٔ بقرۃ میں یہ مضمون بڑی تفصیل سے آیا ہے اور آیت **143** میں امت محمدیہ ﷺ کو امامت کے منصب پر فائز کرنے کا اعلان اِس طرح کیا گیا :

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ اُمَّةً وَّسَطاً لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ﴿﴾

''اور اِسی طرح ہم نے تمہیں ایک درمیانی امّت بنایا کہ تم گواہ بن جاؤ لوگوں پر اور رسولؐ گواہ بن جائیں تم پر۔''

سورہ ٔ حدید کی اِس آیت میں اہلِ کتاب کو امید دلائی گئی کہ وہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں۔ اللہ کو تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ تم اللہ کے آخری رسول ﷺ پر ایمان لا کر اور اُن کی پیروی کر کے پھر سے امت کے منصب میں شریک ہو سکتے ہو اور اللہ کا فضل حاصل کر سکتے ہو۔ سورہ ٔ مائدۃ آیات **65** اور **66** میں یہ مضمون اِس طرح بیان ہوا :

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿﴾ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ

''اور اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور اللہ کی نافرمانی سے بچتے تو ہم اُن سے اُن کی خطائیں دور کر دیتے اور اُن کو ضرور نعمت کے باغوں میں داخل کرتے۔ اور اگر وہ قائم کرتے تورات اور انجیل کو اور جو (اور کتابیں) اُن کے رب کی طرف سے اُن پر نازل ہوئیں تو وہ کھاتے (اللہ کی

نعمتیں) اپنے اوپر سے اور اپنے پاؤں کے نیچے سے۔''

اللہ کا فضل اُس کے اپنے ہاتھ میں ہے اور اُس پر کسی اور کی اجارہ داری نہیں۔ اللہ جسے چاہتا ہے اپنے فضل سے نوازتا ہے۔ اپنے آپ کو حسنِ نیت اور پاکیزہ کردار سے فضل کا حق دار ثابت کرو، اللہ ضرور فضل سے نوازے گا، وہ بڑے فضل والا ہے۔ اُس کے فضل کو ہم اپنے حساب کتاب سے نہیں تول سکتے، نہیں ناپ سکتے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اپنے فضل سے وافر حصہ عطا فرمائے، دین کا فہم دے، دین کے تقاضوں کا شعور بخشے اور اِن تقاضوں کو عملاً ادا کرنے کا عزم کر لینے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین